صحابیتؓ اور قرآن
مصنف: الحاج علامہ سید محمد جعفر زیدی شہید

التماس سورۂ فاتحہ برائے ایصال ثواب
محمد حسین جیوانی ابن اکبر حسین جیوانی

صحابیت اور قرآن

مصنف :

الحاج علامہ سید محمد جعفر زیدی شہید

التماس سورۂ فاتحہ برائے ایصال ثواب
حاجی حسن علی ابن رحمت اللہ
نور بانو بنت قاسم علی
زہرا بانو بنت محمد علی
محمد حسین ابن اسماعیل قاسم

ناشر

رحمت اللہ بک ایجنسی۔ ناشران و تاجران کتب

بمبئی بازار نزد خوجہ شیعہ اثنا عشری مسجد کھارادر کراچی ۲

تعداد ___ سید محمد شبر جعفری۔

فہرست مضامین

اطلاع عام

کتاب ہذا شیعی نقطہ نگاہ سے مرتب کی گئی ہے۔ جو افراد اپنے عقائد پر تنقید پسند نہیں کرتے وہ اس کا مطالعہ نہ کریں۔

البتہ ایسے حضرات جو صحتمندانہ مباحثات میں دلچسپی رکھتے ہیں اور افہام و تفہیم میں غیر جانبدارانہ رویّہ کے حامل ہیں وہ تحقیق حق و باطل کی خاطر مندرجہ معروضات پر ضرور غور فرمائیں امید ہے کہ اُن کے طبائع سلیم پر یہ کتاب بار نہ ہوگی اور انشاء اللہ راہِ نجات کا سنگِ میل ثابت ہوگی۔

اداریہ

صحابہ کے متعلق شیعہ نقطۂ نظر

شیعوں پر ایک مستقل الزام ہے کہ وہ اصحاب رسولؐ کو نہیں مانتے اور ان کی شان میں گستاخی کرتے ہیں یہ ایک گمراہ کن الزام ہے جسکا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ شیعہ یقیناً اصحابِ رسولؐ کا احترام کرتے ہیں۔ واجب التعظیم سمجھتے ہیں اور اپنی دعاؤں میں ان کے نام سے مخصوص نمازیں بھی ادا کرتے ہیں اور امام چہارم حضرت علی ابن الحسینؑ زین العابدینؑ کے مشہور مجموعۂ "صحیفۂ کاملہ" میں صحابہ کے لیے خاص دعا موجود ہے۔ ان حالات میں یہ کہنا کہ شیعہ صحابہ کو نہیں مانتے کہاں تک درست ہے؟

اس مسئلہ پر شیعوں اور سنیوں کے عقیدہ میں البتہ ایک بنیادی فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اس حدیث کو

قابل قبول نہیں سمجھتے جس کی رو سے رسول اللہؐ سے یہ منسوب
کیا گیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میرے صحابی ستاروں کے
مانند ہیں، جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔ یہ عقلاً
بھی محال ہے کہ صحابۂ رسولؐ اپنے زمانے کے سب مسلمانوں کو
بلاتخصیص (مسلم، مومن، منافق، سابقون، الاولون، مہاجر،
انصار) سب کو یہی درجہ عطا فرما دیں اور اس طرح ہر ایک
صحابی کو ہر دوسرے صحابی کی رہنمائی کے قابل قرار دے دیں
اس طرح ہدایت دینے والا کون ہوگا اور ہدایت پانے والا
کون؟ سنی حضرات بھی صحابہ کو جائز الخطاء سمجھتے ہیں جو
خطا کر سکتا ہو وہ ہدایت دینے والا کس طرح بن سکتا ہے؟
قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر رسولؐ کے ساتھیوں کا
ذکر ہے جن میں وہ بھی ہیں جن کی شان میں بشارت دی
گئی ہے اور وہ بھی ہیں جن پر عذاب الٰہی کا اشارہ بھی ہے
گویا نیک اور بد مسلمان (منافق، مسلم، مومن) رسولؐ

کے ساتھیوں میں موجود تھے۔ لہٰذا یہ ہر شخص کا فرض ہو
جاتا ہے کہ وہ نیک و بد میں تمیز کرے تحقیق حق کا ذریعہ
پورا کرے اور پھر صرف انہی کو قابل پیروی قرار دے جو نیک
معیار پر پورے اتریں۔ اور تمام صحابہ کو بلاامتیاز قابل
اتباع نہ جانتے۔ صحابہ کے لفظ کی وسعت اس قدر
قرار دے دی گئی ہے کہ ہر وہ مسلمان جو رسولؐ کی
صحبت سے ایک دو مرتبہ فیض یاب ہوا وہ بھی صحابی،
جس نے محض شکل دیکھ لی وہ بھی صحابی، جو ان کی خدمت
میں رہا، ہر مشکل میں ساتھ دیا، غزوات میں مشرکین سے
جنگ آزما ہوا اور جوہر شجاعت دکھائے۔ ظاہر ہے کہ صرف
صحبت ہی معیار فضیلت نہیں۔ جب کہ صحبت سے کچھ
حاصل نہ کیا ہو۔ گویا شیعہ اور سنی صحابہ کو مانتے ہیں مگر
اپنی اپنی تحقیق کے مطابق۔ صحابہ کے لفظ کو قرآن کی رو
سے تقدیس حاصل نہیں۔ اس موضوع پر ایک علمی

بحث ہمارے کتابچہ "صحابیت کا قرآنی تصور" میں اسی مقصد
کے لیے کی گئی تھی کہ اس مسئلہ پر کوئی غلط فہمی نہ رہے
جو بلاغ القرآن نے تحفظ ناموس صحابہ کے عنوان سے
شائع کیا تھا اہلِ قرآن (یا منکرِ حدیث گروہ) نے اپنے
ماہنامہ اگست ۶۷ء میں لکھا تھا، قرآن کی رُو سے تمام
صحابہ حقے سچے مومن تھے۔ اس کے جواب میں ہمارے
کتابچہ میں اس بات پر علمی بحث کر کے ثابت کیا تھا کہ
صحابہ یا صحابی اپنے مروجہ معنوں میں قرآنی اصطلاح
نہیں ہے۔ ہر وہ شخص یا گروہ جو کسی وقت خاص میں
کسی کے ساتھ ہو وہ اسکا "صاحب" کہلائے گا۔ بہر حال
اس علمی تحقیق کے جواب میں بلاغ القرآن نے
ناموس صحابہ نمبر مارچ ۶۸ء شائع کر کے اپنی قرآن دانی
کا پول کھول دیا، اور غلط مبحث کر کے بہت کچھ لکھ
ڈالا لیکن اصل نکتہ سے دور اور غیر متعلقہ باتوں سے

بھرپور۔

الحمد للہ کہ فخر المتکلمین مولانا سید محمد جعفر صاحب
قبلہ کی قلمی کاوش کے نتیجہ میں ہم یہ خصوصی شمارہ
صحابیت اور قرآن کے نام سے شائع کر رہے ہیں
اس میں قرآن اور صرف قرآن کی روشنی سے مخالف
کے ہر نظریہ کا مسکت اور محکم جواب موجود ہے۔ ہر
بالغ نظر انسان اس سے استفادہ کر سکتا ہے یہ شمارہ اس
مسئلہ پر یہ حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمیں یقین
ہے۔ اب اس مسئلہ کا کوئی پہلو بھی تشنہ نہیں رہا
اور ہر پہلو سے جواب مسکت دے دیا ہے۔

ہم کسی مناظرہ کا رنگ اختیار کرنا نہیں چاہتے
محض علمی بحث کے طور پر ان غلط فہمیوں کا دور کرنا
مقصود تھا جو اس موضوع پر پھیلائی جا رہی ہیں۔
اگر کسی صاحب کی جبین شکن آلود ہو جائے تو ہم

اس کی طرف اب توجہ نہ دیں گے ۔

قارئین کرام سے امید ہے کہ انھوں نے جس گرم جوشی سے "صحابیت کا قرآنی تصور" کا استقبال کیا تھا اسی طرح وہ اس رسالہ کی تشہیر میں بھی اپنا فریضہ ادا کریں گے۔

جن حضرات نے امامیہ مشن کا کتابچہ ۲۰۶ "صحابیت کا قرآنی تصور" ملاحظہ نہیں فرمایا ان کی خدمت میں پر زور سفارش ہے کہ وہ اس کتابچہ کو ضرور حاصل کریں ۔

آخر میں ہم مولانا صاحب محترم کے انتہائی سپاس گزار ہیں کہ آپ نے اس دور کے خطرناک فتنہ کی سرکوبی کے لیے بامقصد کامیاب کوشش فرمائی ہے ۔

مقدمہ

بیانِ واقع

(از خامہ مبارک شمس العلماء جناب مولانا السید سبط حسن صاحب قبلہ مدظلہ العالی)

کاروان رفت بہ بیدینی و دنیا طلبی
تاکنون آتش آن پائے مسافر سوزو

یہ معمولی کہانیاں تھیں جو ہم نے ماننے والوں کے زبانی کہہ سنائیں بلکہ یہ وہی عبرتناک قصے ہیں جو اہل عقل کے لئے بہت سی مشکلیں حل کردیتے ہیں اور بطلان مذہب یا حقیت مسلک سے حقیقت پوش پردے ہٹا دینے کے ذمہ دار ہیں۔ زور حق بھی کیا چیز ہے جو باطل کے قدم کو جمنے نہیں دیتا یہ قدرت خدا دیکھو کہ معاویہ کے ہزاروں دینار و درہم اگرچہ حدیثوں کے وضع کرنے میں معین ہوئے لیکن وہ اس بات کو ہرگز بھی نہ چھپا سکے کہ یہ وضعی حدیثیں معاویہ کے کہنے سے بنائی گئیں

اس پردے کے چاک کرنے کے لئے فقہائے ملت
اسلامی کو ایک پیسہ بھی صرف کرنے کی ضرورت
نہ ہوئی بلکہ وہ جامہ کتان کی طرح قمر تحقیق کے
سامنے تار تار ہوگیا۔ اگر غور کرو تو تمہیں معلوم
ہوجائے گا کہ ابوالحسن مدائنی سے لکھوادینے والی
شے انعام و اکرام نہ تھا بلکہ وہ زور حق تھا جس کو
بغیر ظاہر کئے ہوئے دل صبر نہ کرسکا۔

یہ بات واضح ہے کہ خدا و رسول کے احکام و
اقوال کے بدل دینے میں یا ذات مبارکۂ جناب
باریؐ اور جناب رسالتمابؐ پر افترا کرنے میں ذرہ
برابر نہ معاویہ کو باک تھا اور نہ اس کے اتباع کو
اس کی پروا تھی اور کس قدر زمانہ مقدینین اہل
اسلام سے صاف ہوگیا تھا کہ طمع مال و زر سے
تعمیل حکم معاویہ فوراً" کی جاتی تھی چاہے قرآن محو
ہوجائے یا حدیث رسولؐ

پھر اب اصحاب کو جیسا سمجھیں تاریخ ہم سے

کچھ اور کہتی ہے دنیا ہم سے کچھ اور کہتی ہے
واقعات کو دیکھتے ہوئے اس بات میں ذرہ برابر
شک نہیں رہتا کہ محبت دین و اصحاب ایک مقام پر
جمع نہیں ہوسکتی۔

تنبیہہ

اصحاب کا لفظ میں نے اس لئے لکھا کہ زبان قوم
پر یہی لفظ ہے اور اس سے مراد ان کے وہی اصحاب
ہیں جن کی جلالت کے سکے ان کے دلوں پر بیٹھے ہوئے
ہیں مگر اس کی کوئی وجہ اب تک سوائے دنیا طلبی سمجھ
میں نہیں آئی وہ صحبت نبیؐ جس کا حاصل ان اوصاف
فاضلہ سے متصف ہے جو دربار رسالتمابؐ میں دیدۂ حق
بین کو نظر آتے تھے اور ان دینی افاضات سے متاثر
ہوتا جو سماع و استماع وحی و تنزیل سے قلب ذی ہوش
پر برابر فائض ہوا کرتے تھے۔ یہ بیشک جس کو میسر
ہوجائے وہ ضرور مالک فضیلت ہوسکتا ہے لیکن جو صحابی

کی تعریف کی گئی ہے وہ تو اور ہی چیز ہے صحیح ترین
تعریف صحابی وہ ہے جو اسی اعتراف کے ساتھ کتاب
اصابہ میں درج ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں۔ ان
الصحابی من لقی النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم مومنابہ
ومات علی الاسلام فیدخل فیمن لقیہ من طالت مجالستہ لہ
او قصرت و من روی عنہ اولم یروومن غزامعہ اولم الجزو
من راہ رہ تیہ ولولم یجالسہ ومن لم یرہ لعارض کالعمی۔
یعنی صحابی وہ ہے جس نے مومن ہونے کی حالت میں
پیغمبرؐ سے ملاقات کی ہو اور وہ اسلام ہی کی حالت پر
فوت ہوا ہو اس تعریف میں تمام وہ لوگ داخل ہیں
جنہوں نے اس حال مذکور میں پیغمبرؐ سے ملاقات کی ہو
چاہے ان کی نشست حضرتؐ کی خدمت میں دیر تک
رہی ہو یا کم رہی ہو وہ لوگ بھی داخل ہیں جنہوں نے
آنحضرتؐ سے کوئی روایت کی ہو یا نہ کی ہو وہ لوگ
بھی اس تعریف میں مندرج ہیں جنہوں نے آپؐ کے
ساتھ کفار سے جنگ کی ہو یا نہ کی ہو۔ وہ لوگ بھی

شامل تعریف ہیں جنہوں نے حضرتؐ کو دیکھ لیا ہو چاہے
پاس نہ بیٹھے ہوں یا نہ دیکھا ہو تو کسی مانع کی جہت سے
نہ دیکھا ہو جیسے کوری چشم وغیرہ۔ یہ تمام لوگ صحابی
کہلاتے ہیں۔ ہر شخص اس تعریف کو دیکھ کر سمجھ سکتا
ہے۔ کہ کہاں تک یہ تعریف فضائل کے وجود کو ثابت
کرسکتی ہے۔ اور کہاں تک اس کا کمال ذاتی اس وجہ
سے پایہ ثبوت کو پہنچ سکتا ہے۔ خصوصاً جب ایمان کی
قید پر لحاظ کیا جائے تو یہ قید قطعاً واقعی ہوگی اس لئے
کہ فرضی چیز سے واقعی چیز کے آثار مترتب نہیں
ہوسکتے پھر واقعی ایمان پر اطلاع تو سوا اس ذات کے
جو خطرات قلب ونگاہ دزدیدہ چشم سے مطلع ہے ہم کو
آپ کو نہیں ہوسکتی لیکن تعریف صحابی جو کچھ بھی کی گئی
ہے وہ ہماری شناخت کے لئے ہے تاکہ ہم اس کی
جلالت قدر کو ملحوظ رکھیں تو اب لامحالہ ایمان ظاہری
پر بنا ہوگی اور جب ایمان ظاہری پر تعریف صحابی کی بنا
ہوگی تو جو واقعی مومنین ہیں ان پر بھی تعریف صادق

آئے گی اور جو واقع میں منافقین ہیں ان پر بھی تعریف
صحابی صادق آئے گی۔ ایسے وقت میں منافقین بھی
واجب الاحترام ہوں گے حالانکہ پیغمبرؐ کو (اگر موقع
ملتا) تو منافقوں سے جہاد کا حکم تھا کیونکہ وہ لوگ حتماً
بحکم تاویل کافر ہیں جیسا آیتہ کریمہ
یاایھا النبی جاہد الکفار و المنافقین واغلظ علیھم وماولھم
جھنم وبئس المصیر۔ اے نبی کافروں اور منافقوں سے
جہاد کرو اور ان پر سختی اور شدت کرو ان کی بازگشت
جہنم ہے اور وہ بری بازگشت ہے پھر جب تعریف صحابی
اسقدر عام ہے کہ نہ مومنین قرآن کو بھی اپنی گود میں
لے لیتی ہے تو ایسی تعریف سے سوائے توہین دین مبین
اور انہدام اساس شرع متین اور کیا حاصل ہو سکتا
ہے اچھا ہم نے مانا بفرض محال کہ تعریف صحیح ہے لیکن
کیا وہ لوگ اس تعریف کے قابل نہیں جنھوں نے پیغمبرؐ
کو دیکھا بھی پاس بیٹھے بھی جنگ بھی ساتھ کی ہر ہر جزو
کے ساتھ ایمان بھی لائے۔ پیغمبرؐ نے اس کی تصدیق

بھی کی مثلاً" عمار کیا ان پر تعریف صحابی نہیں صادق
آتی لیکن وہ زدوکوب کے قابل ٹھہرے اور ایک نے
بھی ہتک حرمت کرنے والے کو برا نہ کہا کیا ابوذر
صحابی نہ تھے جن کو کس حال خراب سے پہلے شام
چھوڑنا پڑا پھر مدینہ ربذہ میں غریبی کی موت آئی۔
کیا ابن مسعود صحابی نہ تھے جب ان کی پسلیاں
توڑی گئیں۔ تو وہ کیوں صحابی کی تعریف سے خارج
کردیئے گئے۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ نہ
اصحاب سے مراد قوم ہیں نہ ان کا اجلال دنیا کے ذہن
نشین ہے اس کے اندر ایک بڑا راز ہے۔ جس کو
لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔ مگر اس کی اظہار میں پہلو
تہی کرتے ہیں درحقیقت مصداق اصحاب واجب
الاحترام ان لوگوں کے نزدیک وہ ہیں جو جناب علیؑ بن
ابیطالبؑ سے یا تو محبت نہ رکھتے ہوں یہ قسم ادون
ہے اور قسم اعلیٰ میں وہ لوگ ہیں جو امیرالمومنینؑ سے
بغض رکھتے ہوں۔ یہ راز کوئی شخص منہ سے نہ کہے گا

لیکن واقعہ یہی ہے جس قدر راوی حدیث آل طاہرینؑ
سے الگ ہے اسی قدر اس پر وثوق بڑھتا جاتا ہے اور
جس قدر آل طاہرینؑ سے محبت کی جہت سے قریب ہے
اسی قدر اس کے صفات میں قدح ہوتی جاتی ہے مثلاً"
فرض کرو۔ ابوالصلت ہروی ہیں جو اصحاب امام رضا
علیہ السلام میں سے ایک ممتاز بزرگ ہیں ان کے لئے
ذہبی اپنی میزان الاعتدال میں لکھتا ہے کہ رجل صالح
الا انہ شیعی ابوالصلت ایک مرد صالح ہے مگر (عیب یہ
ہے) کہ وہ شیعی ہے صاف آشکار ہے کہ ذہبی کی نظر
میں تمام صلاح اور تمام ان کی صفات ایک شیعیت کی
وجہ سے فنا ہوگئے یہ وہ ہی بات ہے جو ہم کہہ رہے
ہیں محمد بن ابی بکر حضرت عائشہ کے (جو تمام اہل سنت
کے نزدیک پیغمبرؐ کی ازواج کی سرتاج ہیں) بھائی تھے
ہوسکتا تھا کہ محمد بن ابی بکر کو یہ لوگ عائشہ ہی کی وجہ
سے خال المومنین کہتے لیکن نہیں اس معزز لقب کے
لئے معاویہ تلاش کیا گیا حالانکہ ام حبیبہ کا نام اس

طرح نہیں لیا جاتا جس طرح عائشہ کا نام لیا جاتا ہے
وجہ یہی ہے کہ محمد بن ابی بکر کے دل میں امیرالمومنین
کی محبت جاگزین تھی اور معاویہ کے دل میں عداوت
تھی لہذا صاحب عداوت کو صاحب محبت پر ترجیح دی
گئی اور لقب خال المومنین ان کو نذر دیدیا گیا عمر بن
سعد لعنہ اللہ کو دنیا پہچانتی ہے کہ وہ کیسا ملعون اور
قاتل سردار جوانان اہل بہشت ہے لیکن تقریب
التہذیب صفحہ ۱۵۴ میں یہ عبارت ہے۔ عمر بن سعد بن
ابی وقاص المدنی نزیل الکوفۃ صدوق لکن مقتہ الناس
لکونہ امیر اعلی الجیش الذین قتلوا الحسین بن علی انتھی۔
یعنی عمر بن سعد بن ابی وقاص مدنی وارد کوفہ نہایت
راست گفتار ہے مگر لوگ اس وجہ سے (کہ وہ اس
لشکر کا امیر تھا جس نے حسینؑ ابن علیؑ کو قتل کیا تھا)
اس کو دشمن رکھنے لگے ذرا ابن حجر عسقلانی کی رسولؐ
کے مقابلہ میں یہ جرات دیکھو کہ وہ ابن سعد کو راست
گفتار سمجھتا ہے لہذا جان و روح رسولؐ سے جو کچھ

مکالمات ہوئے ان میں سچائی عمر بن سعد کی طرف ہوگی
وہ اسکا ذمہ دار ہے ہم تو اس کو نہ تنہا کاذب بلکہ کافر
اور ممدوح کافر و کاذب سمجھتے ہیں۔ اور اس کلام میں
اس سے زائد بھی ایک قابل مواخذہ بات ہے اور وہ
یہ ہے کہ اس نے یہ لکھا ہے۔ لکن مقتہ الناس (مگر
لوگوں نے اسے معتوب قرار دے دیا) اس سے صاف
ظاہر ہے کہ ابن سعد کو لوگوں نے دشمن سمجھا لیکن
ابن حجر ایسا نہیں ہے بلکہ وہ اس کا دوست اور اس کا
مداح ہے۔

ہوں گا میں شرمندہ یا ظالم کا پردا جائیگا
سامنے آئے تو روز حشر دیکھا جائیگا

یہیں سے یہ راز بھی سمجھتے چلو کہ تمام صحاح ستہ
میں صحیح بخاری سب سے زیادہ کیوں معتبر ہے اور اس
کی لم کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب اہل بیتؑ سے
تعصبات کو کام میں لاکر تحریر کی گئی ہے خیر اور راویوں
کا میں تذکرہ نہیں کرتا لیکن ان راویوں کا ذکر کرتا

ہوں جو اس صحیح کے ماننے والوں کے نزدیک نہایت
درجہ اعلیٰ قسم میں داخل ہوں گے۔ رواۃ صحیح بخاری
میں سے ایک راوی مروان بن الحکم ہے۔

تقریب تہذیب میں ہے کہ لایثبت لہ صحبتہ یعنی
اس کا شمار صحابہ میں نہیں ہے۔ جب اس کے باپ حکم
کو پیغمبرؐ نے طائف کی جانب مدینے سے نکالا ہے تو یہ
بھی ہمراہ تھا پیغمبرؐ نے کبھی جیتے جی نہ اسکا سامنا کیا نہ
اس کو مدینہ میں آنے کی اجازت دی تھی حکم کی وہ
خطا جس کی وجہ سے وہ جلاوطن کیا گیا اس میں اختلاف
ہے بعضوں نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ پیغمبرؐ کے راز اور
اسرار چھپ چھپ کر سنا کرتا تھا اور اس کو مشہور کرتا
پھرتا تھا اور منافقین و کفار کو اس سے مطلع کرتا تھا
جب پیغمبرؐ پر یہ بات ظاہر ہوئی تو آپ نے اس کو مدینہ
سے نکلوادیا اور بعضوں نے یہ سبب بیان کیا ہے کہ
آپ کی خلوت کی صحبتیں جو ازواج کے ساتھ ہوتی
تھیں ان صحبتوں کی باتوں پر مختلف حیلوں سے اطلاع

حاصل کرتا تھا اور ان باتوں کو تمسخر کی صورت میں
منافقین سے بیان کیا کرتا تھا۔ اور بعضوں نے یہ سبب
بیان کیا ہے کہ پیغمبرؐ کی چال کی پس پشت آکر نقلیں کیا
کرتا تھا چونکہ دل میں پیغمبرؐ سے اس کو خاص کدورت
اور حددرجہ کا حسد تھا اس لئے العیاذ باللہ وہ تمام باتیں
عمل میں لاتا تھا جس سے ذات مبارکہ کی سبکی ہو ایک
دن پیغمبرؐ اس فعل پر مطلع ہوئے اور اس بات پر نظر
کی کہ وہ پس پشت آپ کی چال کی نقل کررہا ہے فرمایا
کذالک فلتکن یا حکم اے حکم یوہیں ہوجا اس حکم کے
ملتے ہی اعضا نے قہری اطاعت شروع کردی اور پھر
کبھی جسم نحس میں سوائے رعشہ و جنبش سکون نہیں
میسر ہوا۔ حضرت عائشہ نے مروان سے ایک مخاطبہ
میں کہا تھا امالنت یا مروان فاشھدان رسول اللہ لعن اباک
وانت فی صلبہ۔ یعنی لیکن تو اے مروان تو میں شہادت
دیتی ہوں کہ پیغمبرؐ نے تیرے باپ پر اس وقت لعنت کی
جب تو اس کے صلب میں تھا۔ امیرالمومنین علیؑ بن

ابیطالبؑ نے ایک دن مروان کو دیکھا فرمایا تیرے لئے
بھی سخت آفت کا سامنا ہے اور امت محمدؐ کے لئے بھی
تیرے اور تیرے بیٹوں کے سبب سے (اس وقت جب
بڑھاپے کی سفیدی تیری دونوں کنپٹیوں کو گھیرے)
آفت کا سامنا ہے جب یہ خلیفہ بنایا گیا تو اس کے بھائی
عبدالرحمٰن بن حکم نے اس کے متعلق یہ شعر کہے۔

فواللہ ماادری وانی لسائل
حلیلۃ مضروب القفا کیف تصنع
لحااللہ قوماامر واخیط باطل
علی الناس یعطی مایشاء و یمنع

مروان چونکہ طویل القدر ہونے کے ساتھ ہی
ساتھ مضطرب بھی تھا اس لئے اس کو لوگ خیط باطل
یعنی باطل کاڈورا کہتے تھے اور چونکہ یوم الدار میں
کسی نے اس کی پیٹھ پر اس زور سے مارا تھا کہ یہ منہ
کے بل زمین پر گر پڑا تھا اس لئے اس کو لوگ
مضروب القفا کہتے تھے۔ "ترجمہ یہ ہوا کہ خدا کی قسم

مجھے معلوم نہیں کہ مروان کی زوجہ کیا کرتی ہے مگر میں
اس سے پوچھوں گا۔"

خدا لعنت کرے اس قوم کو جس نے باطل کے
ڈورے کو لوگوں پر حاکم بنادیا کہ وہ جو چاہے دے اور
جو چاہے نہ دے "پیغمبرؐ کے حکم نے اسکے باپ کو اور
اسے مدینے سے باہر کرویا تھا لیکن عثمان چونکہ اموی
خاندان سے تھے جب یہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے
باوصفیکہ سنت شیخین پر بیعت کی تھی مگر طرید رسولؐ
اللہ کو برادری سمجھ کر بلا بھیجا۔ یہ واقعہ صریحاً" مخالف
رسولؐ تھا۔ اور گویا عثمان نے بلاخوف و خطر حکم پیغمبرؐ
پر خط نسخ کھینچا اور بلالیا یہ تمام تفصیل استیعاب عبدالبر
اور شرح ابن ابی الحدید میں قول امیرالمومنین علیہ
السلام کے ذیل میں مذکور ہے جو نہج البلاغہ میں
مندرج ہے چونکہ حالات مروان پر اس کلام مبارک
سے روشنی پڑتی ہے لہٰذا ہم اسے بھی ذکر کرتے ہیں۔

ومن کلام له علیه السلام قاله لمروان ابن الحکم بالبصرة

قالوا اخذ مروان ابن الحکم باسیر یوم الجمل فاتشفع الحسن
والحسین علیهما السلام الی امیرالمومنینؑ فکلماه فیه فخلی
سبیله فقالاله یبایعک یا امیر المومنین فقال علیه السلام اولم
یبایعنی بعد قتل عثمان لاحاجة لی فی بیعته انهاکف
یهودیة لوبایعنی بکفه لغدر بسبته اماانه له امراة کلعقة
الکلب انفه و هوابوالا کبش الاربعة و ستلقے الامة منه
ومن ولده یوما احمر۔

آپ کا کلام وہ جو مروان بن حکم کے لئے بصرہ میں فرمایا تھا

بیان کرنے والوں نے بیان کیا ہے کہ جب مروان بن
حکم جنگ جمل میں اسیر کیا گیا تو اس نے جناب امام
حسن اور جناب امام حسین علیہما السلام کو امیرالمومنین
علیہ السلام کی طرف اپنا شفیع بنا کر بھیجا۔ دونوں

شاہزادوں نے اس خبیث کی شفاعت کی تو آپ نے
اسے چھوڑ دیا۔ دونوں صاجزادوں نے حضرت کی
خدمت میں عرض کیا کہ یہ آپ سے بیعت کرے گا تو
حضرتؑ نے ارشاد کیا۔

کیا یہ عثمان کے قتل کے بعد مجھ سے بیعت نہیں
کرچکا مجھے اس کی بیعت کی ضرورت نہیں۔ یہ
یہودیوں کا ہاتھ ہے ایک طرف سے بیعت کریگا دوسری
طرف سے عذر کریگا مگر اس کے لئے ایک چھوٹی سی
امیری ہے جیسے کتا اپنی ناک چاٹتا ہے (یعنی ایک
تھوڑی دیر) وہ چار رئیسوں کا باپ ہے۔ امت کو
اس سے اور اس کی اولاد سے ایک سخت دن کا سامنا
ہوگا۔

کلام مبارک سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک
یہودی نما مسلم تھا جس کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہ
تھا عداوت اہل بیتؑ نبیؐ اس کے رگ وپے میں
سرایت کئے ہوئے تھی اور حق بجانب تھی کیونکہ پیغمبر

کے ساتھ اس کے خیالات اچھے نہ تھے اور وہ نکال
دینے کا کینہ دل میں جاگزیں رہتا تھا اسی نے امام حسن
علیہ السلام سے العیاذ باللہ کہا تھا کہ تمہارا گھرانا ملعون
گھرانا ہے۔ فض اللہ فاہ خدا اس کا منہ توڑے گویا یہ
سفیہ پیغمبرؐ کی اس لعنت کا جواب دے رہا تھا جو آپنے
اس کے باپ پر کی تھی دوانحالیکہ یہ اس کے صلب میں
تھا۔

اور یہی وہ غیر مہذب ہے جس نے ولید سے مدینہ
میں کہا تھا کہ حسینؑ جانے نہ پائیں ورنہ ہاتھ نہ آئیں
گے اسی کے حرکات و سکنات کی وجہ سے عثمان پر جو
کچھ ہونا تھا وہ ہوگیا تاہم بخاری اس کو اپنے صحیح
راویوں میں لیتا ہے اور اس کو نہایت ثقہ اور معتبر
سمجھتا ہے اور اس کے اقوال کو دلیل سنت و احکام
خیال کرتا ہے لیکن طرفداران رسول صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم کے لئے یہ امریوں ناگوار ہے کہ پیغمبرؐ کا
نکالا ہوا آدمی اسی نبیؐ کی شریعت میں دخیل ہوجائے

اور اس کے احکام ایسے شخص کے ذریعہ سے ثابت
کئے جائیں یہ ایذائے نبیؐ ہے کیونکہ آپ کا ذلیل کیا
ہوا شخص سلسلہ رواۃ میں لاکر محترم قرار دیا گیا اور
آپ کا نکالا ہوا صف رواۃ میں داخل کیا گیا یہ مخالفت
وایذاے نبیؐ نہیں تو اور کیا ہے مگر بات وہی ہے جو ہم
نے کہی ہے کہ عداوت اہل بیتؑ اس انتخاب کا سبب
ہوئی ہے دوسرا راوی صحیح بخاری عمران بن حطان
خارجی ہے۔ یہ وہ ملعون ہے جس کے بغض
امیرالمومنینؑ کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ اس نے
ابن ملجم ملعون نطفہ حرام کے اس ضربت کی تعریف کی
ہے جو سرمبارک خاتم الوصیین امیرالمومنینؑ روحنا فداہ
پر اس کافر نے ماری میں ان اشعار کو ہرگز نقل نہ
کرتا لیکن اس لئے نقل کرتا ہوں کہ بخاری کی اس
عداوت پر روشنی پڑے جو اس کے دل میں اہل بیتؑ
نبویؐ کی جانب سے ہے۔
چونکہ نقل کفر کفر نہیں اس لئے میں ان ملعون

شعروں کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھتا ہوں اور خدا
سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ مجھ سے اس کا مواخذہ نہ
فرمائے۔

یا ضربۃ من تقی ماارادبہا
الا لیبلغ من ذی العرش رضوانا

انی لاذکرہ یومافا حسبہ
اوفی البریۃ عنداللہ میزانا

ماحصل ترجمہ شعر ملعون یہ ہے کہ یہ ضربت متقی کی
ضربت تھی اور اس غرض سے لگائی گئی تھی کہ خدا کی
رضا حاصل ہو۔ وہ ملعون کہتا ہے کہ میں اسے کسی دن
یاد کرتا ہوں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ میزان عمل میں یہ
ضربت سب سے زیادہ بھاری نکلے گی خدا اس قائل
کے دہن کو جہنم کی آگ سے بھرے۔ میرا دینی فرض
ہے کہ میں ان شعروں کو یوں بدل دوں جس کے لئے
قدرت نے ان شعروں میں جگہ چھوڑ دی ہے۔

یا ضربۃ من شقی ما ارادبہا
الا لیبلغ من ذی العرش نیرانا

انی لاذکرہ یومافا حسب
اشقی البریۃ عنداللہ میزانا

ماحصل ترجمہ اب یہ ہوا کہ یہ ضربت شقی کی تھی
جو اس لئے لگائی گئی تھی تاکہ صاحب عرش اس کو جہنم
کی آگ تک پہنچا دے میں کبھی اس کا خیال کرتا ہوں
تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وزن عمل کرنے کے وقت
سب سے زیادہ بدنصیب وہی ہے۔امام ابو الطیب طبری
نے ان ملعون اشعاروں کا یوں جواب دیا ہے۔

انی لابرء ممانت تذکرہ
عن ابن ملجم الملعون بہتانا

انی لاذکرہ یوما فالعنہ
دیناو العن عمران بن حطانا

یعنی میں اے عمران بن حطان اپنی برائت ظاہر
کرتا ہوں ان چیزوں سے جن کو تو ابن ملجم سے

حکایت کرتا ہے اور وہ سب جھوٹ اور بہتان ہیں۔
میں تو اس کو جب یاد کرتا ہوں تو بمقتضائے دین اس پر
لعنت کرتا ہوں اور عمران بن حطان پر بھی لعنت کرتا
ہوں (ایک شعراس میں اگر اور بڑھ جاتا تو اچھا ہوتا)

وکل من ردہذا اللعن العنہ
حتی انال من الرحمان رضوانا

یعنی جو شخص اس لعن سے انکار کرے میں اس پر بھی
لعنت کرتا ہوں تاکہ خدا مجھ سے خوش ہو (اور یہ میرا
اعتقاد ہے) قاضی حسین کو دیکھو کہ انہوں نے اشعار
طبری کو دیکھ کر یہ عبارت لکھی ہے۔ ہذاالذی قالہ القاضی
ابوالطیب خطاء فان عمران صحابی لایجوز لعنۃ
یعنی قاضی ابو الطیب نے جو عمران پر لعنت کی وہ
خطا ہے کیونکہ وہ صحابی ہے اس پر لعنت جائز نہیں ہے
کس قدر اس عبارت پر سادہ لوحی برس رہی ہے جس
کی کوئی انتہا نہیں یہ بزرگ اگر ہوتے تو پیغمبرؐ سے یہ
کہتے کہ آپ حکم پر لعنت کررہے ہیں حالانکہ اس پر

تعریف صحابی صادق آتی ہے اور یہ ناجائز ہے۔

اس حسن ظن کی کوئی حد ہے کہ صحابہ صحابہ ہونے کے بعد کعبہ کے جس رکن کو چاہیں ڈھادیں کوئی باز پرس نہیں ہے یہ تو دنیا میں کسی کے لئے نہیں ہوا جو صحابہ کے لئے تجویز کیا جاتا ہے۔ اصابہ میں عسقلانی نے لکھا ہے۔ قال القاضی تاج الدین و عجب من الامرین ولیس عمران صحابیاوانما ہومن الخوارج یعنی ان دو باتوں سے تعجب ہے ایک تو اس بات سے کہ ایسے فعل شنیع پر لعنت جائز نہ ہو دوسرے اس بات سے کہ عمران صحابی کہا جاتا ہے حالانکہ وہ خوارج میں سے تھا صحابی نہیں ہے۔ اسی اصابہ میں ہے۔ وممن عاب علی البخاری و اخراج حدیثہ الدار قطنی فقال عمران متروک لسوء اعتقادہ وخبث مذہبہ یعنی ان لوگوں میں جنہوں نے اخراج حدیث عمران بن حطان پر بخاری کو معیوب قرار دیا ہے دار قطنی ہے اس نے کہا ہے کہ عمران چونکہ بداعتقاد اور خبیث المذہب ہے اس لئے

متروک ہے۔

اب قابل نظر یہ امر ہے کہ صرف خارجی ہونا مذہبی نقطہ نظر سے ترک کے لئے کافی تھا لیکن عنوان خارجیت کو عنوان صحابیت سے بدل کر قابل روایت قرار دینا یہ گھورے پر کا سبزہ ہے جس کا پردہ سریع الزوال ہے یہ جو کچھ بھی کیا جاتا ہے صرف عداوت اہل بیتؑ کی وجہ سے ورنہ ناقابلیت راوی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے ابوداؤد بھی بخاری کا ہمصفیر ہے اور وہ بھی عمران بن حطان کے ساتھ اپنا محشور ہونا گوارا کرتا ہے کاش اسلامی دنیا اب بھی اپنی آنکھ سے بندھی ہوئی پٹی کھول ڈالے تاکہ اس کو سواد باطل میں حق کی روشنی نظر آئے۔

روایان صحیح بخاری میں سے

ایک حریز بن عثمان بھی ہے

یہ امیرالمومنین علیہ السلام کا پکا دشمن اور راہ

دین کا شناختہ رہزن تھا یہ مردک جب امیرالمومنینؑ کا
تذکرہ کرتا تو ایسی باتیں گڑھ کے بیان کرتا تھا جس سے
العیاذ باللہ شان امام معصوم میں نقص ظاہر ہو بسااوقات
جھوٹی روایتیں جن کا سچائی اور راستی سے کوئی لگاؤ
نہیں ہوتا تھا محض اثبات قدح امام علیہ السلام کے لئے
بیان کرتا تھا۔

محدثین اسلام نے بیان کیا ہے کہ مرنے کے بعد
حریز کسی کو خواب میں نظر آیا اس سے پوچھا گیا کہ
کیوں مرنے کے بعد خدا نے تجھ سے کیا معاملہ کیا اس
نے جواب دیا کہ وہ بخش دیتا اگر میں علیؑ کا دشمن نہ
ہوتا۔ یہ کاذب کہا کرتا تھا کہ معاذاللہ امیرالمومنینؑ
نے حرام رسولؐ کو حلال کیا تھا جیساکہ ابوبکر احمد بن
العزیز جوہری نے کتاب سقیفہ میں اس کی روایت کی
ہے محفوظ بن مفضل نے ایک دن یحییٰ بن صالح سے
کہا کہ تم حریز کے امثال سے روایت کرتے ہو آخر
حریز نے کیا جرم کیا ہے جو تم اس سے نہیں روایت

کرتے کہا کہ میں ایک دن حریز کے پاس گیا تھا اس نے
مجھے ایک کتاب دی میں نے جب اس میں نظر ڈالی تو
اس میں یہ عبارت مرقوم تھی۔ حدثنی فلان عن فلان
النبی صلے اللہ علیہ والہ لماحضرتہ الوفاۃ اوصی ان تقطع
یدعلی بن ابی طالب (معاذ اللہ پیغمبرؐ اور یداللہ کے قطع
کرنے کی وصیت) بس میں نے فوراً" کتاب واپس کی
اور میں نے اس شخص سے روایت کرنا حرام سمجھا۔

محمد بن عاصم صاحب الخانات کا بیان ہے کہ ایک
دن حریز نے ہم سے یہ بات کہی کہ انتم یا اہل العراق
تحبون علیؑ بن ابیطالب و نحن مبغضہ قالوالم قال لانہ قتل
اجدادی تم اے ساکنان عراق علیؑ کو دوست رکھتے ہو
اور وہ شخص علیؑ کو دشمن رکھتا ہے لوگوں نے کہا آخر
دشمنی کی وجہ کیا ہے کہا اس لئے کہ علیؑ نے میرے
اجداد کو قتل کیا ہے الان حصحص الحق اب حق ظاہر
ہوگیا۔

تمام دشمنوں کی دشمنی کا زیادہ سبب یہی تھا کہ ان

کے اجداد کفر کی وجہ سے پیغمبرؐ کے حکم اور
امیرالمومنین کی ذوالفقار سے فی النار ہوئے تھے مگر
ایسے ملعونوں کو خدا سے شکوہ ہونا چاہئے اس میں ایک
مطیع حکم خدا معصوم کا کیا قصور ہو سکتا ہے۔

اس کو اتباع بخاری ثقہ کہتے ہیں حالانکہ اسمٰعیل
بن عیاش بیان کرتا ہے کہ میں نے حریز کو یہ کہتے سنا
ہے کہ یہ جو لوگ بیان کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے علیؑ بن
ابیطالب کے لئے فرمایا۔ یا علیؑ انت منی بمنزلتہ ہارون
من موسیٰ۔ یہ حق ہے لیکن سننے والوں کو اشتباہ ہوگیا
اسمٰعیل نے پوچھا کہ اگر سننے والے کو اشتباہ ہوگیا تو
آخر پیغمبرؐ نے کیا کہا تھا اس ملعون نے جواب دیا کہ
بجائے ہارون العیاذ باللہ قارون کہا تھا یہ ہیں وہ لوگ
جو احادیث نبوی میں استہزا اور تمسخر کرنا روا جانتے
تھے اللہ یستہزی بہم ویمدہم فی طغیانہم یعمہون خدا
ان کی ہنسی اڑاتا ہے اور ان کو ان کے طغیان و
سرکشی میں ڈالے رکھتا ہے جس میں وہ سرمارا کرتے

ہیں۔ لیکن بخاری ایسے لوگوں کو اپنے صحیح کا راوی اور
ایسے تحریف کرنے والوں کو ثقہ قرار دیتا ہے کیونکہ
اس کا معیار انتخاب عداوت اہل بیت طاہرین علیہم
السلام ہے۔ بھلا کوئی بات ہے کہ ایسے ایمان فروش
مبدل آیات و سنن ان کے اقوال دلیل و حجت سمجھے
جائیں اور اس قابل ہوں کہ ان کی روایتوں کی تعظیم
و تکریم کی جائے اور امام جعفر صادق علیہ السلام سا
شخص جو حقیقت میں ذریت رسولؐ اور حجت خدا ہو
اور جس کے تبحر کا دنیا اعتراف کر رہی ہو اس کے
اقوال کا بخاری اپنے صحیح میں تذکرہ تک نہ کرے۔
کچھ نہیں صرف یہی ایک غرض ہے کہ جہاں تک ممکن
ہو وقار اہل بیت علیہم السلام دنیا میں قائم نہ رہے۔
وانی لہم ذلک (اور بھلا یہ مراد کہیں پوری ہو سکتی
ہے)۔

جتنے طریقے زوال اثر کے
ہو سکتے ہیں وہ سب برتے گئے

خدا دنیا طلبی کا برا کرے جس نے اہل بیتؑ کے
ساتھ ہر ظلم و ستم کو اس لئے روا رکھا تاکہ وہ کسی
زمانے میں بھی اہل امارت و مستحق خلافت نہ سمجھے
جائیں ممبران سے خالی کرالئے گئے حالانکہ وہ انہیں
لوگوں کے لئے بنائے گئے تھے مسجدوں میں وہ قتل کئے
گئے حالانکہ مسجدیں انہیں کے دم قدم سے بنائی گئیں
اور آباد ہوئیں قرآن ان کے گھر میں اترا اور تفسیر
بیان کرنے کے لئے اور لوگ تجویز کئے گئے جن کو
سوائے دنیا قرآن کے کسی نقطہ سے کوئی غرض نہ تھی
مقامات ان لوگوں کے سپرد کردیئے گئے جن سے زمانہ
جاہلیت کی یادگاریں قائم تھیں اور وہ ذات امت سے
الگ کردی گئی جس کی جبین پر طغرائے انامدینتہ العلم
وعلی بابہانور کے حرفوں میں ابھرا ہوا تھا ہدایت کا کام
وہ کرنے لگے جن کو راستہ بتانے سے بھی نہ سوجھا تو پھر
امت کی ہدایت کی امید کیونکر ہوسکتی ہے۔

سب میں زیادہ جن چیزوں سے دنیاوی وجاہت
متعلق ہے وہ مال وجاہ ہے کیونکہ ہر عاقل پر روشن ہے
کہ اہل دنیا کا میل اور توجہ نہ نبوت کی طرف ہے نہ
امامت کی جانب ایسی ہی صاف طینت اور پاک باطن
وہ لوگ ہیں جن کو دنیا کا جمال جذب کرنے میں تھک
گیا ہو اور وہ اپنی آلٰہی تائیدوں اور ملکی قوتوں سے
بہیمی خواہشوں کو شکست دے چکے ہوں۔ پھر وہ اگر
ہوں بھی تو ہرگز گنتی کے عددوں سے زیادہ نہ ہوں
گے ان کے علاوہ بلااستثنا اتنے اعداد جن کا شمار کسی
حد و انتہا میں نہیں آسکتا دنیا طلبی پر جھکے ہوئے ہیں جن
کی نظروں میں عقبیٰ کی منزلیں ایسی جمیل نہیں معلوم
ہوتیں جو ان کے رخ کو دنیا کے منظر سے پھیردیں۔

ہاں دنیا کی جانب میل کرنے میں نہ موعظہ کی
ضرورت ہے، نہ کسی تہدید و ترغیب کی بلکہ لوگوں کی
غرضیں ان کو مجبور کرتی ہیں۔ کون اس بات کا انکار
کرسکتا ہے کہ سلاطین کو اپنی محبت پیدا کرنے میں کسی
طرح کی کوشش کی ضرورت نہیں ہوئی بلکہ ان کو کسی

طرف متوجہ ہوجانا ہی ایجاد محبت کے لئے کافی ہے ان
کی ایک آواز پر دو لاکھ زبانیں لبیک کہنے کو تیار ہیں۔
چاہے وہ آواز عام سے کسی کو آواز دیں اور نام لیکر
نہ پکاریں۔ لیکن انبیاؑ کو جو دقتیں پیش آتی ہیں ان کو
قرآنی صفحات پر دیکھیئے اور تاریخی اوراق میں ملاحظہ
کیجئے۔ اسی لئے کسی شخص کے بے دست و پا بنانے کی
ترکیب اور ناصروں اور مددگاروں کے گم کردینے کا
طریقہ یہی ہے کہ اس کے اقتدار مالی پر حملہ کیا جائے
چنانچہ اہل بیتؑ کے متعلق ہر وقت اس کا لحاظ رکھا گیا
خیر خلافت تو اموال کے لئے مرکز کہی جاسکتی ہے اس
میں جس قسم کا بھی تنازع واقع ہو وہ خواہشوں کے
حدود کے اندر ہے لیکن وہ کم حقیقت چیزیں جن میں
کچھ بھی ذریعہ رغبت مردم ہونے کی حیثیت تھی وہ بھی
اہل بیتؑ کے پاس رہنا دوراز مصلحت خیال کیا گیا اور
فدک جو پیغمبرؐ کا عطیہ تھا خاندان عصمت سے لے لیا
گیا وہ عذر جو لوگوں کی طرف سے اس موقع پر کئے

جاتے ہیں وہ قرآنی احتجاج کے سامنے ہباء منثور سے
زائد وقیع نہیں لیکن تدبیر ملوکانہ تھی چاہے وہ جائز ہو
یا ناجائز یہاں تک رئیس اہل بیتؑ وارث علوم مرسلین
کی متظلمانہ فریاد اس مطلب پر پیش عقل ایک شاہد
مقبول ہے جو نہج البلاغۃ میں اس عبارت کے ساتھ
مرقوم ہے۔ فواللہ ماکنزتم من دنیا کم تبراولااذ خرت
من غنائمہا وفراولااعلوت لبالی ثوبی طمرابلی کانت فی
ایدینا فدک من کل مااظلتہ السماء فشحت علیہا نفوس قوم
و سخت عنہا نفوس قوم آخرین و نعم الحکم اللہ ومااصنع
بفدک و غیر فدک والنفس مظانہافی غد حلث تنقطع فی
ظلمتہ اثارہاو تغیب اخبارہاو حفرۃ لوزیلفی فسحتہا
واوسعت یدا حافر بالا ضغطہا الحجر و المدروسد فرجہا
التراب المتراکم وانماہی نفسی اروضہا بالتقوی التاتی امنہ
یوم الخوف الاکبرو تثبت علی جوانب المزلق۔ وہ مکتوب
مبارک جو آپؑ نے عامل عثمان بن حنیف انصاری کو
تحریر فرمایا اس میں یہ عبارت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے

خدا کی قسم میں نے تمہاری دنیا سے سونے کو جمع نہیں
کیا اور نہ میں نے اس کی غنیمتوں سے کوئی مال ذخیرہ
کیا اور نہ میں نے اپنے پرانے کپڑے کے لئے کوئی
جامہ مہیا کیا ہاں جو کچھ بھی ہمارے ہاتھ میں تھا تمام
ان چیزوں میں۔ جن پر آسمان نے سایہ ڈالا ہے وہ
فدک تھا اس پر بھی بعض لوگوں کے دل راضی نہ
ہوئے اور دینے میں بخل کیا اور جن کے پاس وہ تھا
انہوں نے اس کا ہاتھ سے چلا جانا گوارا کرلیا خدا اچھا
فیصلہ کرنے والا ہے۔ میں فدک یا غیر فدک کو لے کر
کیا کروں حالانکہ کل ایک ایسی قبر میں نفس کا مقام
ہو گا جس کی تاریکی میں اس کا پتہ بھی نہ ملے گا اور
اس کی خبریں روپوش ہوجائیں گی۔ اور وہ ایک ایسا
گڑھا ہو گا کہ اگر اس کی وسعت زیادہ کی جائے اور
کھودنے والے کے ہاتھ اس میں جگہ نکالنا چاہیں تو
اس میں ڈھیلے اور پتھر گر کر پھر جگہ تنگ کردیں گے
اور اس کے خول میں وہ مٹی بھردیں گے جو اسے

چھائے ہوئی ہے۔ جو کچھ ہے وہ میرا نفس ہے میں اپنے
تقوے کے ساتھ بنا رہا ہوں تاکہ وہ خوف بزرگ سے
محفوظ رہے اور پھسلنے کے مقامات پر ثابت قدم نکلے۔

جو کچھ یہ عبارت (جو جان فصاحت اور کان
بلاغت ہے) کہہ رہی ہے وہ ارباب عقل کے لئے
حالات کا ایک دفتر ہے۔ یوں ہی حقوق ذوی القربیٰ میں
اگر نظر ڈالو تو بہت کچھ مویدات مطلب نظر آئیں
گے۔

جس وقت مال و منال کا یہ عالم ہوا تو وہ چیزیں جو
ارباب دانش و بینش کے لئے خاص ہیں وہ ذاتی
فضائل و مناقب ہیں ان میں اگرچہ سواد عالم کا حصہ کم
ہے لیکن طبقات خاصہ کی نظر اسی جانب رہتی ہے
اگرچہ ان کے افراد بہ نسبت سواد عالم کم ہیں۔

اہل بیتؑ کے لئے یہ جنس خدا نے مخصوص کردی
اور اس کثرت سے مناقب و فضائل انہیں عطا کئے
تھے کہ اگر صحن عالم میں ان کی لڑیاں چھٹکادی جاتیں تو

کسی مخلوق کا دامن خالی نہ رہتا لیکن بڑے افسوس کی
بات ہے کہ ایسا نہ ہونے پایا اس لئے فضائل اہل بیتؑ
کی سیل بنیان کن چند جعلی بندوں سے روکی گئی پہلے
دولت کی وہ دھمکیاں جو ہوش ربا اور جانفرسا تھیں
جیساکہ ہم نے ابوالحسن مدائنی کی کتاب الاحداث سے
اس مضمون کی سابق مضمون میں بیان کردیا دوسرے
اعدائے آل طاہرین کی وہ ترغیبیں جو اہل بیتؑ سے
انحراف کرنے پر مبذول ہوئیں تیسرے وہ جھوٹی حدیثیں
جو کچی حدیثوں کے مقابلہ میں گڑھی گئیں اور انکا بھی
ایک تذکرہ اجمالی گزر چکا اس کی توضیح میں میں جناب
امیرالمومنین علیہ السلام کا ایک کلام پیش کرتا ہوں جو
کتاب مبارک نہج البلاغہ میں مذکور ہے۔ من کلام لہ
علیہ السلام و قد سئلہ سائل عن احادیث البدع و عمافی
ایدی الناس من اختلاف انجرفقال ان فی ایدی الناس
حقاوباطلاوصدقا و کذبا وناسخا و منسوخا و عاما و خاصا و
محکما و متشابھا و حفظاو و ہماولقد کذب علی رسول اللہ

صلی اللہ علیہ والہ وسلم علی عہدہ حتی قام خطیبا فقال
من کذب علی متعمد افلیتبوا مقعدہ من النارواتما اتاک
بالحدیث اربعۃ رجال لیس لہم خامس رجل منافق مظہر
الایمان متصنع بالاسلام لایتاثم ولایتحرج یکذب علی رسول
اللہ صلے اللہ علیہ والہ متعمد افلوعلم الناس انہ منافق
کاذب لم یقبلوامنہ ولم یصد قواقولہ و لکنہم قالوا صاحب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ راہ وسمع منہ و یقف عنہ
فیاخذون بقولہ وقد اخبرک اللہ عن المنافقین بما اخبرک و
وصفہم بما و صفہم بہ لک ثم بقوابعدہ علیہ والہ السلام
فتقربوا الی ائمۃ الضلالۃ و الدعاۃ الی النار بالزوروالبہتان
فولوہم الاعمال وجعلوہم حکاما علی رقاب الناس واکلوابہم
الدنیا وانماالناس مع الملوک و الدنیا الامن عصم اللہ
فہواحد الاربعۃ ورجل سمع من رسول اللہ شیالم یحفظہ
علی وجہہ فوہم فیہ ولم یتعمد کذبافہوفی یدیہ ویرویہ
ویعمل بہ ویقول انا سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ
فلوعلم المسلمون انہ وہم فیہ لم یقبلوہ منہ ولوعلم ہوانہ

کذلک لوقضہ الخ۔ کسی نے جناب امیرالمومنین علیہ
السلام سے پوچھا کہ یہ جو حدیثیں لوگوں کے پاس ہیں
ان میں اختلاف کیوں ہے اور یہ نئی حدیثیں کیسی ہیں
فرمایا کہ لوگوں کے ہاتھ میں حق و باطل بھی ہے جھوٹ
سچ بھی ہے ناسخ و منسوخ بھی ہے عام و خاص بھی ہے
محکم و متشابہ بھی ہے وہ حدیثیں بھی ہیں جو یاد اور
محفوظ ہیں اور ایسی بھی ہیں جو یاد نہیں ہیں فقط وہم ہی
وہم ہے (اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں) جب جناب
رسالتماب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم زندہ تھے تو آپ کی
زندگی ہی میں آپ پر جھوٹ باتیں لگائی گئیں تو آپؐ
خطبہ کہنے کے لئے کھڑے ہوئے اور آپ نے فرمایا کہ
جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھے گا وہ اپنی
جگہ جہنم میں قرار دیگا۔

جو لوگ حدیثیں بیان کرتے ہیں وہ چار قسم کے
لوگ ہیں پانچویں قسم ان کی نہیں ہے ایک تو وہ مرد
نفاق کیش ہے جو اپنا ایمان ظاہر کرتا ہے اور اسلام

والا بنتا ہے اپنے کو گنہگار نہیں سمجھتا اور نہ دروغ بانی
میں کوئی تکلف ہے وہ پیغمبرؐ پر جان بوجھ کر دروغ بانی
کرتا ہے اگر لوگ جانتے ہوتے کہ یہ شخص منافق ہے
تو ہرگز اس کی کہی ہوئی بات قبول نہ کرتے اور نہ اس
کے قول کی تصدیق کرتے مگر لوگوں نے یہ کہا کہ یہ تو
رسول خداؐ کے مصاحب ہیں پیغمبرؐ کو انہوں نے دیکھا
بھی اور ان کو سنا بھی اور ان سے حاصل بھی کیا ہے
اس سبب سے لوگوں نے ایسے شخص کی بات کو قبول
کرلیا۔

حالانکہ خداوند عالم نے جو باتیں منافقین کے
حالات کے متعلق بیان فرمائی اور جو اوصاف ان کے
ذکر کئے ہیں وہ سب معلوم ہیں زندگی پیغمبرؐ میں تو ان
لوگوں کی حالت یہ تھی اور جب یہ پیغمبرؐ کے بعد باقی
رہے تو انہوں نے سرکردگان گمراہی اور جہنم کی طرف
دعوت دینے والوں کی جانب اپنے جھوٹ اور بہتان کو
ذریعہ تقرب بنالیا (اور جب انہوں نے ان کے موافق

پیغمبرؐ پر افترا کیا) تو ان ضلالت کے سرداروں نے ان
مفتریوں کو اپنے کام سپرد کیے اور ان کو حاکم بنا کر
لوگوں کی گردنوں پر سوار کر دیا اور ان کے ذریعہ سے
دنیا کو اپنی عمدہ خوراک بنالی۔ اور لوگوں کا قاعدہ ہے
کہ وہ تو بادشاہوں اور دنیا والوں کا ساتھ دیتے ہیں
شاید ہی کوئی فرد مستثنیٰ ہو جسے خدا نے اس آفت
سے محفوظ رکھا ہو یہ چار قسموں میں سے ایک قسم ہوئی
دوسری قسم وہ شخص ہے جس نے پیغمبرؐ سے کچھ سنا تو
ضرور لیکن جیسا فرمایا تھا ویسا یاد نہیں رہا اور اسے یہ
وہم رہا کہ مجھے درست یاد ہے جان بوجھ کر اس نے
پیغمبرؐ پر افترا نہیں کیا وہ کلام اس کے پاس ہے اس پر
وہ عمل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے رسالتماب صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے اگر اہل اسلام کو یہ
بات معلوم ہوتی کہ اسے وہم ہو گیا ہے تو ہر گز اس کی
روایت قبول نہ کرتے اور اگر اس کے راوی کو خود
بھی معلوم ہو جاتا کہ مجھے وہم ہے تو وہ خود بھی اسے

چھوڑ دیتا اسی طرح آپؑ نے باقی اقسام بھی بیان
فرمائے ہیں جن کے نقل سے اس وقت غرض متعلق
نہیں ہے۔ کلام معصوم سے اس بات کا اچھی طرح
استفادہ ہو گیا کہ حیات رسولؐ میں جھوٹ سے کام لیا
جاتا تھا حالانکہ پیغمبرؐ موجود تھا اور جناب رسالتماب
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قسم کے دروغ اور
بہتان کی سزا بیان کرنی پڑی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ
ایک گروہ ایسا موجود تھا جسے پیغمبرؐ پر افترا کرنے میں
کوئی باک اور کسی قسم کا پس و پیش نہ ہوتا تھا اور یہ
بھی معلوم ہوا کہ اصحاب کے بھیس میں ایسے منافقین
موجود تھے جن کا کام یہی افترا اور دروغ بافی تھا کیونکہ
آپؑ نے لوگوں کا قول ان کے وثوق کے متعلق بیان
فرمایا ہے کہ یہ صحابی ہیں ان کے دیکھنے والے ہیں ان
کے سننے والے ہیں اور ان کلمات سے ان کے موثق
اور معتبر ہونے پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ یہ بھی معلوم
ہوا کہ اس افترا و دروغ و بہتان سے دنیا کا بڑا کام چلا

اور بے دینوں کے لئے یہ کھانا پینے کا آلہ ہوگیا۔ اس
کے ذریعہ سے منصب ملے جاگیریں ملیں۔ سبھی کچھ
ہوگیا۔ ہم اس مقام پر اس کے لئے ایک نمونہ پیش
کرتے ہیں اس نمونے کو دیگ کا چاول سمجھو اور دنیا
ایسی ہی سمجھتی ہے لہٰذا میں نئے خیالات سے کام لینا
نہیں چاہتا ابو جعفر اسکافی اعمش کی روایت یوں بیان
کرتے ہیں کہ لماقدم ابوہریرۃ العراق مع معویتہ عام
الجماعتہ جاالی مسجد الکوفتہ فلمارای کثرۃ من استقبلہ من
الناس جثا علی رکبتیہ ثم ضرب صلعتہ مراراثو قال یا اہل
العراق اتزعمون انی اکذب علی اللہ و علی رسولہ واحرق
نفسی بالنار واللہ لقد سمعت رسول اللہؐ یقول ان لکل نبی
حرماوان حرمی بالمدینتہ مابین عیرالی ثورفمن احدث فیہا
حدثا فعلیہ لعنتہ اللہ والملئیکتہ والناس اجمعین واشہد باللہ
ان علیا احدث فلما بلغ معویتہ قولہ اجازہ واکرمہ دولاۃ
امارۃ المدینتہ۔ جب ابوہریرہ سال جماعت میں معاویہ
کے ساتھ عراق میں پہنچا تو مسجد کوفہ میں آیا۔ جب

دیکھا کہ استقبال میں آنے والوں کی کثرت ہے تو گھٹنے
کے بل بیٹھا اور اپنے سر پر ہاتھ کئی بار مار کے کہنے لگا
کہ اے اہل عراق کیا تمہیں خیال ہے کہ میں خدا اور
رسول پر جھوٹ لگاؤں گا اور اپنے نفس کو آتش جہنم
میں جلاؤں گا میں نے پیغمبرؐ سے یہ سنا کہ ہر پیغمبرؐ کا
ایک حرم ہے اور میرا حرم مدینہ ہے عیر سے لیکر ثور
تک جو شخص اس میں کوئی واقعہ کریگا اس پر خدا و
ملائکہ و ناس کی نفرین ہے یہ بیان کرکے یہ صدق
فراموش بیان کرتا ہے کہ میں خدا کو گواہ کرتا ہوں
العیاذ باللہ کہ جناب امیرالمومنینؑ نے مدینہ میں اس قسم
کے واقعہ کو واقع کیا۔ جب یہ خبر معاویہ کو پہنچی تو اس
نے ابوہریرہ کا بڑا اعزاز و اکرام کیا اور صلہ دیا اور
مدینہ کا حاکم مقرر کردیا یہ تھا وہ نقد ثمر جو فوراً ایک
حدیث کا گڑھ دینے سے حاصل ہوا اور جو اس سے
نتیجہ نکالا وہ اس کے جہنم تک لے جانے کے لئے کافی
ہے۔ وہ واقعہ جس کو ابوہریرہ امیرالمومنین علیہ السلام

کی جانب منسوب کرنا چاہتا ہے وہ قتل عثمان ہے اور یہ
وہی دعوی ہے جس کے ناحق ہونے کے لئے زمانہ
گواہی دینے کے لئے تیار ہے چونکہ اس جھوٹ میں
معاویہ کی ہر حیثیت سے طرفداری تھی اس لئے
ابوہریرہ نے طمع دنیا کو دین پر مقدم رکھا۔ اور افترا
کرکے فوراً" اپنے ایمان فروشی کی قیمت وصول کرلی۔
علمائے اہلسنت بھی اس مطلب کے کذب محض ہونے
سے واقف ہیں اور اہل تشیع کے لئے تو کلام کی اتنی
گنجائش ہے جس کے لئے دفتر وفا نہیں کرسکتے شرح
ابن ابی الحدید میں ہے فاماقول ابی ہریرۃ ان علیاً احدث
فی المدینۃ فحاش للہ کان علیؑ اتقی للہ من ذلک واللہ لقد
نصر عثمان نصر الوکان المحصور جعفر بن ابیطالب لم
یبذل لہ الامثلہ ابوہریرہ کا یہ کہنا کہ معاذ اللہ علی علیہ
السلام نے مدینہ میں کوئی واقعہ کیا تو حاشااللہ علی سے
زیادہ کون متقی ہوگا۔ خدا کی قسم علی علیہ السلام نے
عثمان کی ایسی مدد کی تھی کہ اگر جعفر بن ابیطالبؑ جو

آپ کے بھائی تھے وہ بھی کھڑے ہوتے تو اتنی ہی مدد
کرتے۔

شیخ ابوجعفر نے بیان کیا ہے کہ ابوہریرۃ مدخول
عند شیوخنا غیر مرضی الروایۃ ضربہ عمر بالدرۃ وقال
قداکثرت من الروایۃ واحری بک ان تکون کاذبا علی رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوہریرہ ہماری شیوخ کے
نزدیک اس قابل نہیں کہ اس کی روایت تسلیم کی
جائے عمر نے اس کو درہ سے مارا تھا اور کہا تھا کہ تو
نے بہت زیادہ روایتیں رسولؐ سے کی ہیں۔ تم نے
ضرور پیغمبرؐ پر دروغ بافی کی ہے وروی سفیان الثوری عن
منصور بن ابراہیم التیمی قال کانوالایاخذون عن ابی
ہریرۃ الاماکان من ذکرجنۃ اونار سفیان ثوری نے منصور
بن ابراہیم تیمی سے روایت کی ہے کہ لوگ ابوہریرہ
کی روایت فقط تذکرہ جنت و نار میں قبول کرلیتے تھے
(اس کے علاہ کسی باب میں کوئی روایت مقبول نہیں
ہوتی تھی) خود جناب امیرالمومنینؑ سے روایت ہے کہ

آپ نے فرمایا الاان اکذب الناس علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم ابوہریرۃ الدوسی یعنی تمام لوگوں سے زیادہ پیغمبرؐ پر افترا کرنے والا ابوہریرہ دوسی ہے۔
ثابت ہوا کہ جو کچھ ابوہریرہ نے کہا وہ لغو ہے۔ آئندہ انشاء اللہ ہم اس کی زیادہ توضیح کریں گے۔
وہوالموفق۔ فقط

والسلام

سید سبط حسن

از افادات

حضرت حجۃ الاسلام آقا عبدالحسین شرف الدین موسوی دام ظلہ العالی

صحابیت اور قرآن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً للہ تعالیٰ ومصلیاً علی خاتم النبیین وآلہ الطاہرین ۰

سنی شیعہ اپنے مذہب کے مطابق صحابۂ کرام کے مداح ہیں

بلاغ القرآن اگست ۱۹۶۷ء میری نظر سے گزرا تھا جس کی ابتدا میں تحفظ ناموسِ صحابہ کے عنوان سے ایک مقالہ تھا اور اسی میں کسی جگہ حیاتِ شہداء سے صاف انکار تھا۔ جماعتِ صحابہ جس کی ابتدا خود نبیؐ کے اپنے گھر سے ہوئی شل جناب ابوطالبؑ، فاطمہؑ بنت اسد، خدیجۃ الکبریٰؑ، علیؑ

بن ابی طالب ، حمزۂ سید الشہدا ، جعفر بن ابی طالب پھر
اس کی وسعت مکہ ، مدینہ اور دوسرے مقامات تک پہنچی۔
اس مقدس جماعت کی مدح وثنا کوئی نئی بات نہیں۔ سُنّی
شیعہ دونوں فرقے اپنے اپنے مذہب اور اطلاع کے مطابق
ان کے ثنا خواں ہیں۔ دونوں فرقے قرآنِ کریم سے وابستگی
رکھتے ہیں اور قرآنِ کریم نے اس مقدس گروہ کی یقیناً مدح فرمائی
ہے لیکن قرآن کریم نے اس مدح کی بنیاد ناموں پر نہیں بلکہ صفات
وکردار پر رکھی ہے۔ اسی قرآن نے عہدِ نبیؐ کے ان مسلمانوں کی
مذمت بھی کی ہے جو نبیؐ کے کلمہ گو تو ہو گئے تھے لیکن ان میں سے
کچھ تو بباطن بدستور کافر تھے اور کچھ لوگ تذبذب اور شک کی حالت
میں تھے اور ایمان ان کے دلوں میں جاگزیں نہ ہوا تھا۔ اس مذمت
کی بنیاد بھی صفات وکردار پر ہے مثلاً اچھا ہے وہ جو ایسا کرتا
ہے ، بُرا ہے وہ جو ویسا کرتا ہے ۔ اب یہ کہ کون ایسا کرتا ہے
اور کون ویسا کرتا ہے یہ واقعاتی چیز ہے ۔ نزولِ قرآن کے
وقت وہ واقعات اور آیات دونوں چیزیں سامنے تھیں ۔

واقعات کو دیکھ دیکھ کر آیات کے مصداق کو سمجھنے میں کافی
آسانی تھی اور اس کے ساتھ نبیؐ کی توضیح بھی موجود تھی۔ اس
وقت کے لوگ بڑی حد تک پہچانتے تھے کہ اس آیت کا
ممدوح کون اور اس آیت کا مذموم کون ہے۔ فلاں جنگ
میں ثابت قدم افراد کون ہیں جن کی مدح نازل ہوئی۔ غیر
ثابت قدم کون ہیں جن کی مذمت نازل ہوئی ۔ یہ سب
واقعات جن کے چشم دید تھے ان کو ایک ایک نام معلوم
تھا۔ حاضرین سے یہ واقعات غائبین اور آئندہ نسلوں تک
پہنچے جو کتاب کی صورت میں آئے ۔ بیان واقعات میں سب کا
یک زبان ایک قلم ہونا آسان نہ تھا۔ اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ
اختلاف ہوا لیکن جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ کہیں اختلاف
نہیں اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ کہیں اتفاق نہیں۔ دنیا
کے بڑے سے بڑے نزاعی اور اختلافی قضیہ میں اتفاق کے
حدود نمایاں رہتے ہیں جو ایک محقق کو اختلافی چیزوں میں
سے صحیح اور واقعی چیز تک پہنچا دیتے ہیں۔ عدالتوں میں

دونوں فریق اپنے اپنے مختلف اور متضاد بیان دیتے ہیں
سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کرنے کی انتہائی کوشش کرتے
ہیں۔ عدالت بالکل اجنبی ہوتی ہے۔ نہ وہ کسی فریق سے
متعارف نہ کسی شاہد سے باخبر۔ لیکن وہ انتہائی اختلاف
اور اپنی انتہائی اجنبیت کے ہوتے ہوئے آسانی سے حقیقت
امر معلوم کر لیتی ہے اور اصلیت اس پر کھل جاتی ہے۔
کسی جج کو نہیں دیکھا کہ اس نے یہ کہہ دیا ہو کہ اس اختلاف
کی بھرمار میں کسی صحیح نتیجہ پر میں نہیں پہنچ سکتا۔ لہذا یہ خیال
کر لینا غلط ہے کہ اختلاف بیان کی حالت میں صحیح بات
معلوم نہیں ہو سکتی۔ مذہبی امور کی تحقیق میں بڑے سے
بڑا قابل انسان جو ناکام رہ جاتا ہے اور منزل تک نہیں پہنچ
پاتا اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے خالی الذہن نہیں
ہوتا۔ اس کے دل و دماغ میں پہلے سے کچھ سمایا ہوا ہوتا ہے
وہ خود چاہے یہ سمجھ رہا ہو کہ میں تحقیق کر رہا ہوں لیکن وہ تحقیق
نہیں کر رہا ہے اپنے موجودہ سرمایۂ ذہنی کو بڑھانے کے لیے

تائیدات ڈھونڈھ رہا ہے۔ جو چیز خلاف نظر آتی ہے اسکو
فوراً نظر انداز کر دیتا ہے۔ جو چیز موافق نظر آتی ہے اس کو
اپنے سرمایہ میں شامل کر لیتا ہے۔ تحقیق کر سکتا ہے صرف
وہ جو اپنے اس ذہنی سرمایہ کو جو پہلے سے موجود ہے اسکو
شک و شبہ کی نظر سے دیکھ کر اس امر کا محاسبہ کرے کہ
اس کا غلط ہونا ناممکن نہیں ہے۔ ایسا تو نہیں کہ یہ بالکل غلط
ہو اور صحیح چیز کوئی اور ہو جس دل میں یہ خلش پیدا ہو گئی اور
ذوقِ صحیح نے مدد کی وہ منزل پر پہنچ گیا۔ غرض کہ واقعات
کا صحیح رُخ معلوم کر لینا کوئی مشکل بات نہیں۔ اب اگر
کوئی یہ کہے کہ ہم کو مذکورہ جماعت کی چھان بین کی ضرورت
ہی کیا ہے۔ ان کے اعمال کی باز پُرس ہم سے تو نہ ہوگی
یہ بات کہنے کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن واقعہ یہ ہے
کہ دین اپنے تمام تر اصولی اور فروعی تقاضوں کے ساتھ ہم
تک ان ہی واسطوں سے پہنچتا ہے۔ قرآن اور اس کے
مطالب حدیث اور اس کے موارد یہ سب کچھ ان ہی

ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ نبیؐ تک ہماری رسائی بہرحال
ضروری ہے لیکن جب ہم اس عہدِ مقدس میں نہ تھے تو لامحالہ
اب واسطہ ہی اختیار کرنا ہوگا۔ کون سا واسطہ اختیار کریں؟
یہ سوال چنداں اہم نہ ہوتا اگر اصول و فروع، عقائد و اعمال،
حلال و حرام، اوامر و نواہی میں سب یک زبان ہوتے لیکن
سب یک زبان ہوتے اگر سب یک دل ہوتے اور سب
یک دل ہوتے تو قرآنِ کریم عہدِ نبیؐ کے سب ہی مسلمانوں کی
مدح کرتا۔ یہ نہ ہوتا کہ کسی کی مدح اور کسی کی مذمت قرآنِ کریم
کے یہ دونوں رخ ہی اس لیے ہیں کہ مسلمانانِ عالم تم تک
جو چیز ممدوحین کے ذریعہ سے پہنچے گی وہ صحیح ہوگی اور جو
مذمومین کے ذریعے سے پہنچے گی وہ غلط ہوگی۔ یہ اختلاف
ہی اصل میں ہم سے اس امر کا مطالبہ کر رہا ہے کہ تمہارا وسیلہ
اور ذریعہ ہر طرح سے اسلم، بے خطر اور انتہائی پاک و پاکیزہ
ہونا چاہیے اور اس کا فیصلہ اگر تم خود کرو گے تو اس میں غلطی
کا پورا امکان ہوگا اور اس کے علاوہ تم سب کا فیصلہ بھی

ایک نہ ہو سکے گا۔ اس فیصلہ میں بھی اختلاف ہوگا کہ کون
سا ذریعہ اسلم اور پاک ہے اس صورت میں جس اختلاف سے
تم بچنا چاہتے تھے وہ تم کو مزید اختلاف میں ڈال دے گا
ذریعہ وہ اختیار کرو جس کو اللہ کی تائید حاصل ہو جس کی
پاکیزگی کی اللہ نے شہادت دی ہو۔ جن کی اخروی نجات کی
خبر قرآنِ کریم نے اسی دنیا میں دے دی ہو۔ جن کی مدح
میں ذم کا شائبہ نہ ہو۔ جن کے ایمان و عمل میں دگر گونی نہ ہو
ان کا ماضی، حال، مستقبل ہر زمانہ میں یک رنگ ہو۔ اس لیے
ہماری دینی ضرورت ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم اللہ اور رسول
کے یعنی قرآن و حدیث کے ممدوح اور مذموم کو پہچانیں تاکہ
ہمارا وسیلہ صحیح ہو غلط نہ ہو۔ ممدوح کی مدح اور مذموم کی
مذمت قرآنِ کریم نے یوں ہی نہیں کی بلکہ وہ ہمارے لیے
عنوانِ ہدایت ہے۔ قرآن کسی کی مدح یا کسی کی مذمت کے
لیے نہیں آیا تھا بلکہ قرآن کا کل ہو یا جزو ایک ایک حرف
ہدایت کے لیے ہے اگر ہدایت کے تقاضے مدح و ذم

کے بغیر پورے ہو سکتے تو قرآن جو قانونِ الٰہی کا نام ہے
اس کو ان جھگڑوں سے کیا مطلب تھا۔ افعال و اعمال پر مدح و
ذم تو خود نبیؐ بھی کر سکتے تھے۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ یہ مدح و
ذم اس کتاب کا جزوِ لاینفک بنا دی جائے جس کو مسلمانانِ عالم
کے سامنے باقی رکھنے کی قیامت تک کے لیے اللہ نے ضمانت کی
ہو جو قیامت تک ہر مسلمان کی تلاوت اور سماعت میں آتا ہے
جس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ مذموم بھی جب قرآن پڑھے تو وہ آیتِ
مذمت بھی پڑھے جو اس کے بارہ میں ہے اور جب دوسرا
اس کے سامنے پڑھے تو وہ اس آیتِ مذمت کو بھی سنے۔ وہ
خود نہ رہے لیکن اس کا کردار ہر زبان پر آتا رہے اور ہر کان
تک پہنچتا رہے۔ اگر محض ان ہی کی سرزنش مقصود ہوتی، اگر صرف
ان ہی کی تنبیہہ مقصود ہوتی تو نبیؐ کے ذریعے سے بھی یہ کام لیا جا سکتا تھا
قرآن کی صورت میں اس اشتہارِ عام کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے
صاف پتہ چلتا ہے کہ خداوندِ عالم ہر زمانہ کے مسلمان کو اس
مدح و ذم سے باخبر رکھنا چاہتا ہے تاکہ دیندار ممدوح و مذموم

میں امتیاز کر کے صحیح وسیلہ اختیار کر سکے۔ اس لیے یہ جاننا
ضروری ہوا کہ ممدوح کون ہے اور مذموم کون ہے۔

امرِ حق کی حفاظت کا اور اس کو قائم رکھنے کا

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے

اصول ہوں یا فروع ان میں ایک حد قائم ہوتی ہے
اتفاق کی مثلاً اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ یکتا اور بے مثل
ہے، قدیم ہے، لم یزل اور لایزال ہے۔ محمد مصطفےٰؐ اللہ کے
نبیؐ، رسول اور آخری نبیؐ ہیں۔ قرآن اللہ کی آخری کتاب
ہے۔ کعبہ آخری قبلہ ہے۔ نمازِ پنجگانہ فرض ہے۔ ماہِ رمضان
کے روزے فرض ہیں وغیرہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن پر کُل
امت کا اتفاق اور اجماع رہا ہے اس لیے ان کا صحیح ہونا
یقینی ہے کیونکہ دینِ حق کی حفاظت اور بقا کا اللہ نے وعدہ
فرمایا ہے۔ اس کے بعد آتا ہے اختلاف، مثلاً خدا کا قیامت میں
دیدار ہوگا یا نہیں؟ اللہ کے صفات قدیم ہیں یا حادث،

صفاتِ خدا عین ذات ہیں یا ذات سے الگ، اللہ خیر و شر
دونوں کا خالق ہے یا اس کی طرف سے جو کچھ بھی ہے وہ خیر
محض ہے۔ رسولؐ کے آبا و اجداد کافر ہو سکتے ہیں یا نہیں؟
قبلِ رسالت آپ دیندار تھے کہ نہیں؟ آپ سے قبلِ رسالت یا
بعدِ رسالت کوئی گناہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ قرآن میں آیۂ رجم
تھا کہ نہیں؟ نماز ہاتھ کھول کر پڑھیں یا باندھ کر۔ اگر ان
مسائل میں اصول کے ہوں یا فروع کے اختلاف ہے تو
اس کے یہ معنی نہیں کہ اختلاف دیکھ کر ہم اصل عقائد و اعمال
ہی سے دست بردار ہو جائیں۔ خدا کا ماننا چھوڑ دیں۔ نبیؐ
کا دامن چھوڑ دیں۔ نماز پڑھنا ہی چھوڑ دیں۔ نہ یہ کوئی عقلمندی
ہو گی کہ اختلاف کے ہر متضاد اور متصادم پہلو کو درست سمجھیں
کیونکہ دینِ حق کی بات اصل کے بارہ میں ہو یا فروع کے بارہ
میں ہمیشہ ایک ہے دو نہیں ہو سکتیں لہٰذا اختلاف کا ہر
پہلو صحیح نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اختلاف کی موجودگی کے
یہ معنی بھی نہیں کہ اختلاف کا جو بھی پہلو ہے وہ ہر پہلو غلط

ہے۔ صحیح بات کچھ اور ہے اگر صحیح بات ان تمام اختلافات
سے بالکل باہر کوئی چیز ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ جو دین
کا امرِ حق تھا وہ معدوم ہو گیا اور وہ کہیں بھی باقی نہ رہا اور یہ
ہو نہیں سکتا کہ جس دینِ حق کی حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا
ہو وہ معدوم ہو جائے۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے اِنَّا نَحْنُ
نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ "ہم ہی نے اس
نصیحت کو نازل کیا ہے اور ہم ہی یقیناً حفاظت کرنے
والے ہیں" وہ نصیحت کیا ہے؟ دین۔ قرآن بھی دین ہی کا
زبردست رکن ہے۔ قرآنِ کریم کی حفاظت بھی دین ہی
کی حفاظت کے لیے ہے ورنہ یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ
دین رہے یا نہ رہے قرآن ضرور رہے گا۔ اصل شے تو دین
ہے جس کی رہنمائی کے لیے نبیؐ آئے، قرآن آیا۔ اس ہی وجہ
سے دین کے ان رہنماؤں کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے لفظ الذکر
فرمایا۔ یعنی رسولؐ کو بھی الذکر کہا، جیسے قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ
اِلَیْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ

"یقیناً نازل کیا ہے اللہ نے تمہاری طرف ذکر کو یعنی رسولؐ کو جو کھلی ہوئی آیات کی تلاوت کرتا ہے" اور قرآن کو بھی ذکر کہا۔ اِن ھُوَ اِلَّا ذِکرٌ وَّ قُرآنٌ مُّبِین۔ "نہیں ہے وہ لیکن ایک ذکر اور روشن قرآن"۔ پھر سورۂ صٓ میں قرآن کو ذکر والا فرمایا۔ صٓ وَالقُرآنِ ذِی الذِّکر۔ "صٓ۔ اس قرآن کی قسم جو ذکر والا ہے، یعنی دین کی رہنمائی کرتا ہے"۔ سورۂ انبیاء میں دین حق کو ذکر فرمایا ہے۔ لَقَد اَنزَلنَا اِلَیکُم کِتَابًا فِیہِ ذِکرُکُم اَفَلَا تَعقِلُونَ۔ "ضرور ضرور ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی جس میں تمہارا دین (ذکر) ہے کیا تم عقل نہیں رکھتے۔ پھر فرمایا جاتا ہے۔ یٰوَیلَتیٰ لَیتَنِی لَم اَتَّخِذ فُلَانًا خَلِیلًا لَقَد اَضَلَّنِی عَنِ الذِّکرِ بَعدَ اِذ جَاءَنِی۔ "روز قیامت ایک ظالم کہے گا، کاش میں فلاں کو دوست نہ بناتا اس نے یقیناً مجھ کو دین (ذکر) سے گمراہ کر دیا جبکہ وہ دین مجھ تک آ گیا تھا"۔ غرضکہ ذکر دینِ حق ہے جس کی حفاظت کا اللہ نے وعدہ فرمایا ہے۔ کفار

اور مشرکین اسی دینِ حق کو مٹانا چاہتے تھے لیکن اللہ کے وعدۂ حفاظت کے مقابلہ میں ناکام رہے۔ یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔ "وہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (دین) کو اپنے سانسوں سے بجھا دیں حالانکہ اللہ تو اپنے نور (دین) کو پورا کر کے رہے گا اگرچہ کفار کو ناگوار گزرے"۔ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون ٥ سورۂ صف۔

"وہ (اللہ) وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس دین کو کل دینوں پر غالب کر دے اگرچہ مشرکین کو ناگوار گزرے"۔ لہٰذا جس مسئلہ میں پوری امّت متفق ہے یقیناً وہ حق ہے اور جس مسئلہ میں اختلاف ہے وہ امر حق اس ہی اختلاف کا کوئی موجود پہلو ہے، کیونکہ حق معدوم نہیں ہو سکتا اور چونکہ حق کا وجود ہر زمانہ میں اور ہر لمحہ میں لازمی اور لابدی ہے۔ اس لیے کوئی زمانہ اور کوئی ساعت

اور کوئی وقت حق سے خالی نہیں ہو سکتا۔

ختمِ نبوّت کی بہترین دلیل

اگر صدہا برس تک مسلمانانِ عالم صحابہ، اہل بیت، تابعین، سب کا اس پر اجماع رہا ہے کہ آنحضورؐ کے بعد کوئی نبی نہ آیا ہے نہ آئے گا، تو اگر اس کے بعد کوئی مدعی نبوت پیدا ہوا اور بعض مسلمانوں نے مان بھی لیا تو یہ دعوائے نبوت یقیناً غلط اور باطل ہے کیونکہ دینِ حق کا وجود ہر ساعت اور ہر زمانہ میں لازمی ہے اور حق سے کوئی زمانہ خالی نہیں ہو سکتا لہٰذا جو بھی نظریہ جس کو دین سے نسبت ہو اگر اس کی یہ حالت ہو کہ وہ نظریہ معدوم رہ کر کسی وقت لباسِ وجود پہن لے وہ یقیناً ناحق ہے۔ اگر حق ہوتا تو کسی وقت بھی معدوم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس فرق کو ہر شخص ذہن نشین کرے کہ کسی نظریہ کا وجود اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا لیکن کسی نظریہ کا فقدان اور عدم اس کے ناحق اور باطل ہونے کی دلیل ہے۔

امرِ حق اختلافات ہی کے اندر کی کوئی چیز ہے

اگر کسی مسئلہ دینی میں اختلاف ہے اور اس کے دو یا اس سے زیادہ پہلو ہیں تو یہ اختلاف اپنے تمام پہلوؤں کو لیکر اس امر کا اعلان کر رہا ہے کہ کل امت کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے کہ امرِ حق ان پہلوؤں کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے اس کو اجماع مرکب کہتے ہیں مثلاً شبِ قدر کس رات میں ہے؛ جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ اس پر اجماع امت ہے کہ یہ شب ماہِ رمضان المبارک کی ہے لہٰذا غیرِ ماہ رمضان کا نظریہ اگر کسی وقت وجود میں آئے تو وہ باطل ہوگا کیونکہ پوری امت خطاء پر اجماع نہیں کر سکتی۔ اب تاریخوں کا اختلاف ہے جو مثلاً انیس سے لے کر انتیس تک ہر شبِ طاق کے لیے ہے۔ اس اختلاف کے معنیٰ یہ ہوئے کہ کُل امت اس پر متفق ہے کہ مذکورہ راتوں ہی میں کی کوئی رات ہے جو شبِ قدر ہے اگر کسی وقت مذکورہ راتوں کے علاوہ کسی اور رات کے

لیے کوئی دعویٰ کرے تو وہ یقیناً ناحق ہے کیونکہ اگر وہ حق ہوتا تو نظریۂ حق کا وجود ہر زمانہ میں موجود رہتا۔ اسی طرح اگر نماز میں بحالتِ قیام ہاتھ کھولنے یا باندھنے میں اختلاف ہے تو جس طرح یہ غلط ہے کہ دونوں باتیں صحیح ہیں اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ دونوں صورتیں غلط ہوں اور حق کوئی تیسری چیز ہو جس کا کوئی وجود نہیں۔ اسی طرح اگر خلافت کے بارہ میں کہ بعدِ رسول حضرت ابوبکر خلیفۂ برحق ہیں یا حضرت علیؑ تو جس طرح دونوں نظریے حق نہیں ہو سکتے اسی طرح دونوں نظریے غلط اور باطل بھی نہیں ہو سکتے۔ ان ہی دونوں نظریوں میں سے کوئی ایک نظریہ حق ہے کیونکہ حق معدوم نہیں ہو سکتا۔ اگر وضو کے آخری فرض میں یعنی پیروں کے دھونے اور مسح کرنے میں اختلاف ہے تو کوئی تیسری چیز نہیں ہو سکتی جو حق ہو۔ ان ہی دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ہے جو حق ہے کیونکہ حق کی بقا کا اللہ ضامن ہے۔ اسی طرح اگر پوری امت اس امر پر متفق رہی ہے کہ جنگِ جمل، جنگِ صفین، واقعۂ قتل حضرت

عثمان، واقعۂ کربلا ان واقعات کے وقوع سے صداقتِ قرآن پر کوئی حرف نہیں آتا۔ قرآن کریم نے ان واقعات کے ممکن الوقوع ہونے سے کہیں انکار نہیں کیا۔ ان واقعات کے وقوع کو ماننے والا ہرگز منکرِ قرآن نہیں ہو سکتا بلکہ ان واقعات کے وقوع کی قرآن کریم نے اشارتاً اور حدیث نبوی نے صراحتاً خبر دی ہے (جیسا کہ ہم آئندہ بیان کرینگے) لہٰذا ان واقعات کے وقوع سے اللہ اور رسولؐ کی تکذیب نہیں بلکہ تصدیق ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ واقعات اللہ اور رسولؐ کے خبر دینے کی وجہ سے نہیں ہوئے بلکہ اللہ اور رسولؐ نے جو واقعات کہ ہونے والے تھے ان کے بارہ میں خبر دی اب اگر کوئی صاحب اپنی نئی منطق سے یہ کہنے لگیں کہ ان واقعات کو صحیح ماننے سے قرآن کی تکذیب ہوتی ہے اور قرآن کریم ان واقعات کو غیر ممکن الوقوع قرار دیتا ہے تو یہ جدید نظریہ جس کا کہیں پہلے وجود نہ تھا خود حرفِ غلط ہے۔ اس کے حق ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں کیونکہ اگر یہ نظریہ حق ہوتا

تو ہر زمانہ میں اس کا وجود ہوتا مسلمان سب نہیں تو سب میں
سے کچھ تو اس نظریہ کے حامل اور حامی رہتے۔ حق کا کہیں تو
وجود ہوتا۔ اسی طرح اگر تمام امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ
بدلیلِ قرآنی مقتولین فی سبیل اللہ زندہ ہیں مردہ نہیں ہیں یہ
زندگی کا لفظ مجازی اور غیر حقیقت نہیں ہے اور اب اس کے
بعد کوئی صاحب حیاتِ شہداء کے صاف منکر ہو جائیں اور
کہہ دیں کہ یہ زندگی حقیقت نہیں بلکہ نام نہاد، مجازی، محض
برائے گفتن ہے اور خدا تعالےٰ کی راہ میں مارے جانے والے
انسانوں کی یہ نام نہاد زندگی شرعی طور پر ذبح کیے جانیوالے
جانوروں گائے، بیل، بکری، مرغی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں
رکھتی حالانکہ خدا تعالےٰ نے جانوروں سے تشبیہہ دیتا ہے کفار کو
ان ھم کالانعام بل ھم اضل عن سبیلا۔ یہاں یہ ہے کہ
صرف عام مومنین کو نہیں بلکہ شہداء مومنین کو عوام کالانعام
قرار دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہی نظریہ حق ہوتا تو ہر
زمانہ میں مسلسل اور متواتر رہتا۔ اگر کل امت نہیں تو امت کے

کچھ افراد تو اس نظریے کو اپناتے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کل امت
باطل پر مجتمع ہو جاتے اور حق جس کی حفاظت کے لیے وعدۂ
خداوندی ہے معدوم ہو جائے۔

قرآنِ کریم کو دافعِ اختلافِ اُمّت نہیں قرار دیا جا سکتا

ممکن ہے کوئی صاحب کہیں کہ جس جس مسئلہ میں اختلافِ
امت ہے اس اختلاف کو قرآنِ کریم کے ذریعہ سے کیوں نہ
دور کیا جائے اوّل تو یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے کہ آیا قرآن کریم
نے دین کے تمام جزئیات کو خود حل کرنے کی ضمانت کی ہے؟
اہلِ نظر جانتے ہیں کہ قرآن کریم نے صلوٰۃ و زکوٰۃ تک کے جزئیات
کو بھی بیان نہیں کیا۔ نماز کے رکعات اس کی مرتب صورت
رکعت میں رکوع کا ایک اور سجدہ کا دو ہونا، سفر میں قصر ہر
نماز کے لیے ہے یا کسی کسی میں اگر کسی کسی میں ہے تو کس کس میں
جو نماز قصر ہو گی وہ کتنی کم ہو گی۔ صرف ایک آخری سجدہ یا
دونوں سجدے یا پوری ایک رکعت یا زیادہ، زکوٰۃ کس مال

پر ہے؟ کتنے مال پر ہے؟ کتنے عرصہ میں ہے؟ زکوٰۃ کی
مقدار کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ کچھ بھی تفصیل نہیں ہے۔ بقول
شخصے کہ قرآنِ کریم سے تو کتّے اور بلّی کی بھی حرمت ثابت
نہیں ہے۔ پھر یہ بحث بڑی اہم ہے کہ کیا احکامِ شریعت عموماً
آیاتِ قرآن آنے پر دیے گئے؟ یا یہ کہ قرآنِ کریم نے
عموماً نبیؐ کے دیے ہوئے احکام کی جہاں جہاں مناسب سمجھا
تائید کی ہے۔ میرا نظریہ مستقل طور پر یہ ہے کہ باستثنا بعض
جملہ احکامِ شریعت، حلال و حرام کی تشخیص، عبادات کا
تعین، فرائض کا تقرر یہ سب سرکارِ رسالتؐ نے عالمِ
مشیتِ الٰہی ہونے کی حیثیت سے نافذ کیے اور سرکار کے
نافذ کیے ہوئے احکام کی قرآنِ کریم نے وقتاً فوقتاً تائید
کی ہے اور جب کسی سے پہلے واضح کی ہوئی چیز کی تائید کی جاتی ہے تو تائید
میں بیانِ جزئیات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمارا یہ نظریہ خود
آیاتِ قرآنی سے ثابت ہے لیکن اس بحث کو ہم یہاں چھیڑنا
نہیں چاہتے۔ اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے قرآنِ

کریم کو دافعِ اختلاف اس لیے نہیں قرار دیا جا سکتا کہ ہر اختلاف
کرنے والا اپنے نظریہ کی بنا، قرآنِ کریم ہی کو قرار دیتا ہے
جو ختمِ نبوت کے قائل ہیں وہ بھی اس ہی قرآن سے ثابت
کرتے ہیں اور جو ختمِ نبوت کے منکر ہیں وہ بھی اس ہی قرآن
سے اپنا مدعا ثابت کرتے ہیں۔ حیاتِ جنابِ عیسیٰؑ بھی اسی
قرآن سے ثابت کی جاتی ہے اور ان کی موت بھی اس ہی
قرآن سے، وضو میں پیروں کا دھونا بھی اسی قرآن سے
اور مسح پا بھی اسی قرآن سے۔ خلافتِ علی مرتضیٰؑ بھی اس
ہی قرآن سے اور خلافتِ خلیفۂ اول بھی اسی قرآن سے
حیاتِ شہداء بھی اسی قرآن سے اور نوبت یہاں تک پہنچ
گئی کہ موتِ شہداء بھی اسی قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش
ہے، جنگِ جمل و جنگِ صفین کا وقوع بھی اس ہی قرآن سے
اور ان جنگوں سے انکار کی کوشش بھی اس ہی قرآن سے
غرضکہ ہر شخص اپنے نظریہ کو جائز اور ناجائز قرآن سے دکھا رہا
ہے اور ہر باطل پسند الفاظِ قرآن کو اپنے خود ساختہ معانی

کے سانچہ میں ڈھال رہا ہے۔ اس ہی وجہ سے قرآنِ کریم
نے اپنے آپ کو اختلافاتِ امت کا حَکَم نہیں قرار دیا بلکہ
پیغمبرؐ کو اور صرف پیغمبرؐ کو حَکَم قرار دیتے ہوئے فرمایا
فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ
بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۰ "اے نبیؐ! تیرے رب
کی قسم یہ لوگ مومن نہ ہوں گے تا اینکہ اپنے درمیانی ہر
اختلاف میں تم کو حَکَم اور فیصلہ کن قرار دیں اور جو کچھ بھی
تم فیصلہ کر دو اس کے لیے وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی
نہ محسوس کریں بلکہ (تمہارے فیصلہ کو) ایسا مانیں جو ماننے
کا حق ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم کی اس قرارداد پر کہ اللہ ہمیشہ حق
کی حفاظت کریگا نبی کریمؐ نے فیصلہ کن الفاظ میں فرما دیا کہ میری
امت خطا یعنی ناحق پر کبھی مجتمع نہ ہوگی۔ اس ہی وجہ سے
ہیں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ جو نظریۂ دینی امتِ مسلمہ میں کسی
وقت بھی معدوم رہا ہو اور اس نظریہ کے خلاف کل امت مجتمع

رہی ہو اور پھر کسی وقت بدقسمتی سے وہ نظریہ معرضِ وجود
میں آیا ہو اس نظریہ کے حق ہونے کا کوئی امکان نہیں
البتہ جو نظریات ہر زمانہ میں پیہم اور متواتر و مسلسل چلے
آتے ہوں امرِ حق ان ہی میں سے کوئی ایک نظریہ ہے جس کو
عقلِ سلیم، قرآن کی تاویلِ مسلّم، حدیثِ ثابت اور تاریخ کے
مسلّمہ اور متفقہ واقعات کی روشنی میں تلاش کرنا چاہیے۔

ہماری تاریخ کلیتہً نہ لائقِ تسلیم ہے نہ لائقِ انکار

تاریخ کی حیثیت سے جو کچھ موجود ہے اس سب کی
حیثیت ایک جیسی نہیں۔ اس تاریخ میں وہ چیزیں بھی ہیں
جن کو پوری امت نے بغیر کسی اختلاف کے تسلیم کیا ہے
اور سب یک زبان اور یک قلم ہیں۔ دوسری طرف وہ
وہ چیزیں بھی ہیں جن کے بارہ میں اختلاف ہے۔ ہر چیز کی
مضبوطی اور ہر شئے کا استحکام ایک جیسا نہیں ہوتا بعض
چیزیں انتہائی مضبوط ہوتی ہیں بعض کی مضبوطی کا درجہ اس

سے کم ہوتا ہے۔ انتہائی مضبوط اور مستحکم چیزوں میں اختلاف
اور قیل و قال کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لیے وہاں کوئی اختلاف
ہو ہی نہیں سکا۔ جن چیزوں کی مضبوطی کا درجہ نسبتاً کم ہوتا
ہے اس میں اختلاف ہو سکتا ہے وہاں نقد و تبصرہ کی
ضرورت ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ سلاطین مغلیہ کا
ہندوستان پر حکمران رہنا اتنی مضبوط چیز ہے کہ اس سے
انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح ان کی باہمی ترتیب کہ
بابر، بابر کے بعد ہمایوں، ہمایوں کے بعد اکبر، اکبر کے بعد جہانگیر،
جہانگیر کے بعد شاہجہان، شاہجہان کے بعد اورنگ زیب،
اس سے کون عقلمند انکار کر سکتا ہے لیکن تخت نشینی کے
وقت ان کی عمریں کیا تھیں، وفات کے وقت ان کے
سن و سال کیا تھے؟ یہ چیزیں بیان میں آنے کے باوجود
بھی اتنی مضبوط نہیں ہو سکتیں جتنا کہ ان بادشاہوں کا
یکے بعد دیگرے حکمران ہونا۔ اسی طرح ان بادشاہوں کے زمانہ
کے ایک طرف وہ نمایاں اور مضبوط واقعات ہیں جو ایک

مسلمہ حقیقت ہیں۔ دوسری طرف وہ واقعات اور جزئیات
ہیں جن میں افراط و تفریط کا امکان ہے۔ یہی حال ہماری
تاریخ کا ہے۔ اس تاریخ کے وہ امور جو عالم نشرح بغیر کسی
اختلاف کے مسلمانوں کے ہر مذہب و ملت میں مسلّم اور مشہور
ہیں وہ تاریخ کی روح ہیں۔ ان سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ان سے
انکار کرنا دین سے انکار کرنا ہے۔ تاریخ نام ہے واقعات کا
اور واقعات سے بے نیاز ہو کر نہ کارِ دنیا ہو سکتا ہے نہ کارِ دین۔
قرآن یہ تو کہہ سکتا ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں لیکن یہ بتانا کہ محمدؐ کون
ہیں یہ واقعاتی چیز ہے۔ قرآن یہ تو کہہ سکتا ہے کہ کعبہ جو مکہ میں
ہے اس کا حج واجب ہے لیکن مکہ کون سا شہر ہے اور کعبہ کونسی
عمارت ہے یہ واقعاتی چیز ہے۔ قرآن یہ تو کہہ سکتا ہے کہ نماز
رو بقبلہ ہو کر پڑھو مگر قبلہ کس جانب ہے یہ واقعاتی چیز ہے
قرآن یہ بتا سکتا ہے کہ روزۂ رمضان فرض ہے، روزہ صبح
صادق سے شروع ہوتا ہے اور دن کے ختم ہوتے تک رہتا
ہے لیکن یہ بتانا کہ رمضان شروع ہو گیا، اب صبح ہو گئی، اب

شام ہوئی قرآن کا کام نہیں یہ واقعاتی چیز ہے ۔ اس کو
الگ سے معلوم کرنا ہوگا ۔ ایک جلسہ کے لیے مکمل اشتہار
دیا جاتا ہے جس میں جلسہ کی جگہ جلسہ کی تاریخ جلسہ کا وقت
مقررین کے نام سب کچھ موجود ہے لیکن اس اشتہار میں سب کچھ
ہوتے ہوئے محض اشتہار سے نہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ جو جگہ
لکھی تھی وہ یہ ہے، جو تاریخ لکھی تھی وہ آج ہے، جو وقت
لکھا تھا وہ آگیا، جن مقررین کو لکھا تھا وہ یہ ہیں یہ تمام چیزیں
آپ کو الگ سے معلوم کرنا ہوں گی کیونکہ یہ سب واقعاتی
چیزیں ہیں ۔ واقعات سے نہ دنیا میں کوئی بے نیاز ہو سکتا ہے
نہ دین میں ۔ واقعات کا تشخص تاریخ سے ہوتا ہے ۔ گزرے
ہوئے واقعات کا تاریخ ماضی سے موجودہ واقعات کا موجودہ
تواریخ سے ۔ لہٰذا جہاں تاریخ ہر زبان ہر قلم اور ہر بیان میں
ایک ہو اس سے انکار انتہائی بے ذوقی اور بے عقلی کی دلیل ہے
البتہ جہاں اختلاف ہو وہاں اس درجہ تفحص کرنا ہوگا کہ شک و
شبہ مٹ کر یقین کی حد نظر آجائے ۔ تاریخ کے وہ واقعات

جن کا تعلق ہزاروں مسلمانوں سے ہو وہ واقعات جو کھلے میدانوں
کے ہوں جن کو ہر طبقہ کے مسلم اور غیر مسلم مانتے، لکھتے، کہتے چلے
آئے ہوں اور کسی نے ان کو دروغ بہتان، افسانہ نہ کہا ہو وہ
واقعات تو کیونکر مشتبہ ہو سکتے ہیں تاریخ کا تو وہ واقعہ
بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا جس کا تعلق صرف ایک ہی متنفس
سے ہو کسی چھپی ہوئی جگہ سے ہو، عام نگاہوں سے مخفی ہو
لیکن ہو بلا اختلاف سب کا مانا ہوا ۔ ہجرت نبیؐ کے سلسلہ
میں قرآن کریم نے صرف اتنا کہا ہے کہ غار میں نبیؐ تنہا نہ تھے
بلکہ وہاں نبیؐ کے ساتھ ایک اور بھی تھے ۔ وہ کون تھے ؟
کیا نام تھا؟ کس خاندان سے تھے ؟ اس کا قرآن میں کوئی
ذکر نہیں ۔ قرآن کسی معین ذات کو ماننے پر مجبور نہیں کر رہا ہے
لیکن مسلمانوں کا ہر فرقہ بلا اختلاف یہ مانتا چلا آتا ہے کہ وہ
حضرت ابوبکر تھے ۔ اس نام کا بلا اختلاف ہونا دلیل صحت ہے
نہ شیعوں کو یہ شکایت ہے کہ کسی کی حمایت میں یہ افسانہ
گھڑ لیا گیا نہ سنی حضرات کو یہ شکایت ہے کہ شیعوں نے کسی

تعصب کی وجہ سے اختلاف کیا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم
نے کسی مستورہ پر تہمت بے جا لگائے جانے کا ذکر کر کے فرمایا
کہ یہ بہتانِ عظیم ہے۔ کس پر تہمت لگائی گئی تھی؟ قرآن کریم
نے کسی کا نام نہ لیا۔ تاریخ نے یہ بتایا کہ یہ تہمت ام المومنین
پر لگائی گئی تھی۔ تاریخ کا یہ بیان سنی شیعہ مسلمانوں کے
ہر فرقہ میں متفق علیہ اور بلا اختلاف ہے۔ لہٰذا تاریخ کے اس
بیان اور تعیین نام کو کیوں نہ حقیقتِ واقعی سمجھا جائے۔
حضرات شیعہ کسی مسئلہ میں حضرت ابوبکر یا حضرت عائشہ
پر لاکھ تنقید کریں لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ غار
میں آنحضرتؐ کے ساتھ حضرت ابوبکر نہیں کوئی اور تھا یا
قرآن نے جس بی بی کی پاکدامنی کی گواہی دی وہ حضرت عائشہ
نہ تھیں کوئی اور بی بی تھیں۔ روضۂ رسولؐ میں حضرت ابوبکر اور
حضرت عمر کے دفن ہونے کا واقعہ کوئی قرآنی واقعہ تو نہیں صرف
تاریخی واقعہ ہے مگر بلا اختلاف ہے۔ اس لیے سنی شیعہ دونوں میں
سے کوئی بھی اس واقعہ کا منکر نہیں۔ اگر تاریخ بلا اختلاف یہ بتاتی

ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے بعد مسلمانوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت
کی اور وہ عامۃ المسلمین کے خلیفہ، فرمانروا اور صاحبِ اقتدار
ہوئے اور ان کے بعد ان کی وصیت سے حضرت عمرؓ ہوئے
اور ان کے بعد حضرت عثمان اور ان کے بعد حضرت علیؑ خلیفہ
ہوئے تو اس تاریخی حقیقت کو سنی، شیعہ دونوں فرقوں نے
بلا اختلاف تسلیم کیا اور کر رہے ہیں۔ کسی کو تاریخ کے مسلّمہ
واقعات سے انکار نہیں۔ اگر تاریخ یہ بتاتی ہے کہ حضرت عمر
کے زمانۂ خلافت میں فتوحات کی وسعت ہوئی اور دور دراز
کے علاقے اور ممالک زیرِ نگیں ہوئے تو شیعوں کو کبھی اس سے
انکار نہیں ہوا۔ اسی طرح جنگِ جمل اور جنگِ صفین، جنگِ نہروان
اور واقعۂ قتل حضرت عثمان ہر اسلامی فرقہ کے نزدیک بلا اختلاف
تاریخی مسلّمات ہیں۔ اب ان واقعات سے انکار کرنا ایک طرف
قرآن کو جھٹلانا ہے کیونکہ قرآن فیصلہ کر چکا ہے کہ امرِ حق کا وجود
ہر زمانہ میں رہے گا۔ وہ معدوم نہیں ہو سکتا۔ اگر حق یہی ہوتا کہ
یہ جنگیں نہیں ہوئیں تو یہ نظریۂ حق ہر زمانہ میں ہوتا، ناپید

نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف قولِ نبیؐ کو جھٹلانا ہے۔ سرکار فیصلہ کر چکے ہیں کہ میری امت (پوری) باطل پر مجتمع نہیں ہو سکتی۔ باطل پر یہ اجماعِ امت ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر ان جنگوں کا ہونا امرِ باطل ہوتا تو یہ مسئلہ ایک لمحہ بھی بلا اختلاف نہ رہتا۔ پھر پوری امت کا ان جنگوں پر متفق ہونا امت کا اس امر پر اجماع کرنا قرار پا گیا کہ ان جنگوں کا وقوع کسی بیانِ قرآن اور کسی آیتِ قرآن کی صداقت کو مجروح نہیں کرتا بلکہ قرآن نے تو ایسے واقعات کے وقوع کی اور ایسے قتال اور بغاوت کی اشارتاً خبر دی ہے جیسا کہ ہم آئندہ اس کو واضح کریں گے۔ اب تاریخ کی مسلّم ان جنگوں سے انکار کرنا قرآن و حدیث کا انکار ہے اور اپنی تمام ملت کو بے دین قرار دینا ہے۔

شیعہ اجماعِ امت کے قائل ہیں

مدیر بلاغ القرآن نے تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر کے صفحہ ۹۶ پر لکھا ہے :-

"شیعہ حضرات کی طرف سے اجماعِ امت کا لفظ پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کیونکہ اثنا عشری مسلک کو امت کے اولین اجماع متعلقہ خلافت ہی کا انکار ہے تو کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ پیامِ عمل کون سے اجماع کی خبر دے رہا ہے۔"

ہم نے اجماعِ امت کا لفظ اپنے پہلے کتابچہ "صحابیت کا قرآنی تصور" میں بھی لکھا ہے اور اب بھی ہم برابر یہ لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ مدیر بلاغ القرآن کے تعجب پر ہم کو تعجب ہے "پیامِ عمل" اس اجماعِ امت کی خبر دے رہا ہے جس پر پوری امت کا اجماع ہو اور کسی کو اختلاف نہ ہو۔ ادھورا اور جزئی اجماع اس وقت تک کوئی چیز نہیں جب تک اس میں معصوم کی شرکت نہ ہو۔ جس اجماع کی خبر آپ دے رہے ہیں نہ تو وہ کل امت کا اجماع ہے نہ اس میں کسی معصوم کی شرکت ہے جب آپ اس جزئی اجماع کو تسلیم کرتے ہیں جس میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف شامل ہوں تو ہم اس اجماع کو کیوں نہ تسلیم

کریں جس میں پوری امت متفق ہو۔ اور اگر پوری امت نہ ہو تو
ان میں سے کوئی فرد شامل ہو جنکی عصمت و طہارت کی خبر قرآن کریم
کے آیۂ تطہیر نے دی۔ رسولؐ کے اہلبیت ایک طرف امت کے بہترین
افراد ہیں دوسری طرف وہی امت کے امام ہیں ان کے بغیر کوئی
اجماع حقیقتاً اجماعِ امت نہیں۔

کیا مسلمانوں کی تاریخ عجمی سازش کا نتیجہ ہے؟

عجمی سازش یہ ایک لفظی پردہ ہے جو ہمیشہ عرب کے مومن نما
غیر مومنین کی سیہ کاریوں کو چھپانے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے
سرکارِ مدینہ کے عہدِ مبارک میں صرف ایک عجمی کا پتہ چلتا ہے یعنی
سلمان فارسی۔ یہ وہ معتمد اور معتبر صحابی ہیں جو فرقِ اسلام
میں سب کے نزدیک ممدوح اور کامل الایمان ہیں۔ کفار بے شک
ان پر یہ تہمت لگاتے تھے کہ قرآن کے مصنف اصل میں سلمان
ہیں اور سلمان قرآن تصنیف کرکے محمدؐ کو دیتے ہیں۔ اس کا ذکر
خود قرآن نے کیا ہے لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ

وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ۔" وہ جس کی طرف یہ لوگ
قرآن کو منسوب کرتے ہیں وہ تو عجمی ہے اور یہ قرآن کھلا ہوا زبانِ
عربی ہے۔" پہلے کفار نے قرآن کو عجمی سازش قرار دیا پھر ان کی
دیکھا دیکھی کچھ مسلمانوں نے تاریخ کو عجمی سازش قرار دے دیا
غرضیکہ عجمی سازش سے نہ قرآن بچا نہ تاریخ بچی۔ حالانکہ نہ قرآن
عجمی سازش ہے نہ تاریخ۔ اگر تاریخ میں کچھ غلط سلط چیزیں
آگئی ہیں تو وہ بعض حکومتوں کا دورِ حکومت ہے۔ اَلنَّاسُ
عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ۔ عجم غریب تو محکوم تھا۔ اس کو حکومت
اور خلافت سے کیا تعلق تھا۔ عجم کی خلافت تو کیا ہوتی خلافت
کی مسند پر تو وہ مدنی انصار بھی نہ آسکے جن کی جا بجا قرآن نے
مدح کی ہے اور یہ انصار خود خلافت سے تو کیا قریب آسکتے
تھے ان کو تو یہ بھی حق نہ تھا کہ شوریٰ میں شامل ہو کر ہونے والے
خلیفہ کے بارے میں رائے ہی دے سکیں۔ یہ ہے وہ اسلامی
جمہوریت جس کا نام رکھا جاتا ہے۔ خلیفہ ہو تو قریش اور مجلسِ شوریٰ
میں رائے دے سکے تو قریش۔ پھر یہ منطق بھی عجیب ہے کہ خلافت

رسولؐ کے گھر والوں میں رہیگی تو یہ قیصر و کسریٰ جیسی ملوکیت ہو جائیگی مگر رسولؐ کا اپنا قبیلہ ہونے کی وجہ سے قریش میں رہیگی تو یہ ملوکیت نہ ہوگی۔ غیر قریش کتنا ہی قابل ہو، متقی ہو، عادل ہو مگر وہ چونکہ رسولؐ کے قبیلہ کا نہیں اس لیے حقدارِ خلافت نہیں۔ یہاں تک کہ قریش کا وہ شخص تک انصار سے افضل و اعلیٰ اور حقدارِ خلافت ہے جو نہ سابقین اولین میں ہو نہ مہاجرین میں ہو جس کے ایمان لانے کے وقت کی حالت اتنی خطرناک اور مشکوک ہو کہ قرآن کریم تک نے مولفۃ القلوب کہہ دیا ہو۔ کفار نے قرآن کو عجمی سازش کیوں کہا تھا؟ اس کا کیا تُک تھا؟ صرف اس لیے کہ قرآن نے اہلِ عرب کی سخت سرزنش کی تھی۔ کہیں فرمایا الاعراب اشدُّ کفراً وّ نفاقاً کہیں اہلِ مکہ کے لیے فرمایا۔ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ کہیں اعراب کے ساتھ اہلِ مدینہ کے لیے فرمایا من الاعراب منافقون ومن اہل المدینۃ مردوا علی النفاق۔ کہیں فرمایا۔ قالت الاعراب آمنّا قل لم تؤمنوا ولکن

قولوا اسلمنا۔ کہیں فرمایا۔ ومن الناس من یقول آمنّا باللہ وبالیوم الآخر وما ھم بمؤمنین۔ غرض کہ قرآن کریم نے عرب کی وہ لے دے کی کہ کفار کو یہ خیال ہو گیا کہ عرب کو اتنا سخت سست کوئی عجمی ہی کہہ سکتا ہے۔ اسی طرح تاریخ بھی جن بعض بعض چہروں کو داغدار دکھاتی ہے وہ بھی اتفاق سے عربی نژاد بلکہ مکّی اور مدنی ہیں۔ اس لیے تاریخ کو بھی عجمی سازش کہہ دیا گیا۔ اگر قرآن نے عرب کے بجائے عجم کی مذمت کی ہوتی اور تاریخ بھی عرب کے بجائے عجم کے پیچھے پڑی ہوتی تو اس صورت میں یہ نہ کہا جاتا کہ یہ سازش عجم ہے مگر نہ قرآن غلط گوئی کر سکتا تھا نہ تاریخ کو یہ موقع تھا کہ وہ رسول کے عہد کے مسلمانوں کو یا رسول کے قریب العہد لوگوں کو عجم بتا دے۔ تاریخ کا یہ پہلو تو مجبوراً قرآن کے ساتھ رہا اور قرآن سے مطابقت کے سوا اس کے لیے کوئی راستہ ہو ہی نہ سکا۔ عجمی سازش کہنے والوں سے کوئی پوچھے کہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بُت لا کر کیا عجم نے رکھ دیے تھے؟ کعبہ کا برہنہ

اور سیٹی بجاتے ہوئے طواف کرنا اہلِ عرب کو کیا عجم نے سکھایا
تھا؟ کیا فحاشی اور بے حیائی پر یہ فخریہ اشعار کسی عجم کے ہیں؟

ومثلک حبلی قد طرقت ومرضع،
فالھیتھا عن ذی تمائم محول،
اذا ما بکی من خلفھا انصرفت لہ،
بشق وتحتی شقھا لم تحول،

ترجمہ لکھتے ہوئے حیا آتی ہے۔ مگر شاعر کی بے حیائی
اور اس کے ذکر میں یہ بے حیائی۔ پھر بعثتِ نبیؐ پر صاحبِ
خلقِ عظیم کو انتہائی جور و جفا، ظلم و تعدی کا نشانہ کیا عجم نے
بنایا تھا؟ کیا وہ عجم تھے جنھوں نے مرنجاں مرنج نبیؐ کو اپنے
گھر، اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا؟ کیا نبیؐ پر مدینہ پہنچ جانے
کے بعد چڑھائی عجم نے کی تھی؟ یہ نبیؐ کا جھوٹ موٹ مکاری سے
کلمہ پڑھنے والے جن کو قرآن کریم نے منافقین، فاسقین، مذبذبین
اور کیا کیا کچھ کہا ہے کیا یہ عجمی تھے؟ کیا یہ مخلفین جو کلمہ گو ہونے
کے باوجود گھروں میں بیٹھے رہتے تھے اور میدانِ جہاد میں جانا

گوارا نہ کرتے تھے وہ عجمی تھے؟ جو لوگ نبیؐ کو ریتی تلواروں میں
اور نرغۂ کفار میں چھوڑ کر چلے جاتے تھے کیا یہ عجمی تھے؟ جن
لوگوں کو قرآن نے بار بار طالبِ دنیا کہا۔ منکم من یرید
الدنیا، بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا، تریدون
عرض الدنیا۔ کیا یہ لوگ عجمی تھے؟ یہ بات بھی دیکھتے
جائیے کہ قرآنِ کریم نے ان کی دنیا طلبی کو صیغۂ ماضی میں نہیں
بلکہ ہر جگہ صیغۂ مضارع میں بیان فرما کر ظاہر کر دیا کہ یہ دنیا
طلبی ختم نہیں ہوئی بلکہ ماضی کی طرح یہی ان کا مستقبل ہے
میدانِ قتال تو پھر خطرناک جگہ ہے جو لوگ خطبۂ نمازِ جمعہ
میں نبیؐ کو کھڑا چھوڑ کر خرید و فروخت اور لہو و لعب کے
لیے چلے جاتے تھے کیا وہ عجمی تھے؟ کیا تقسیم صدقات میں نبیؐ
کی تقسیم کو نامنصفانہ کہنے والے اور نبیؐ کو الزام لگانے والے
نبیؐ کو کچے کانوں کا کہنے والے نبیؐ کو اذیت دینے والے
اور جہاد کے لیے نبیؐ کے حکم دینے پر زمین کو بوجھ بن کر
چمٹ جانے والے کیا یہ لوگ عجم کے تھے؟ اب بتائیے کہ

جن لوگوں کے مزاج کی افتاد بروئے قرآن یہ ہو اور ایسے حرکات جن کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہو کیا ایسے لوگوں کا مسلمانوں میں فتنہ و فساد کی آگ کو بھڑکا دینا اور آمادۂ خونریزی ہو جانا اور جس دین میں وہ ناخوشی سے آئے تھے اس دین سے خوش ہو کر ان کا نکل جانا کوئی تعجب کی بات ہے! ان لوگوں کا یہ کردار قرآن اور قرآن کی مطابقت میں تاریخ اگر بیان کرے تو اس کو فتنۂ عجم قرار دینا بجائے خود فتنہ گری ہے اگر عجمی سازش نے مسلمانوں کی تفسیر، تاریخ، کلام اور فقہ سب کو پلٹ کر رکھ دیا تو عرب کہاں سو رہے تھے اور پاسبانِ حرمین کہاں تھے؟ کوئی تو اپنے گھر کی صحیح تاریخ بتاتا، کوئی کتاب تو عجمی سازش سے بچتی۔

عجمی سازش سے کیا مراد ہے؟

اگر عجمی سازش سے شیعہ مراد ہیں اور یہ مطلب ہے کہ ان لوگوں نے اپنے مسلک کی حمایت میں بقول مخاطب اول

تو منافقوں کے قتل عام کا واقعہ جو عہد رسول ؐ کا تھا اس کو ایسا چھپا دیا کہ جو نہ کسی سنی زبان پر آسکا نہ کوئی سنی قلم لکھ سکا نہ کسی کو یاد رہا پھر ان لوگوں نے جمل اور صفین کے معرکے تصنیف کیے، واقعۂ قتل حضرت عثمان گھڑا کہ اہلِ مدینہ بھی اپنے امیر کا صحیح واقعۂ وفات یعنی طبعی موت کو اپنے ہاتھوں سے ان کو غسل دینا، کفن پہنانا اور ہزاروں کا مل کر جنازہ اٹھانا، نماز جنازہ پڑھنا، دفن کرنا سب بھول گئے اور اب ان کے سامنے صرف ان کے قتل اور خون آلود قمیص کا بے بنیاد طلسمی منظر رہ گیا اور وہ اس طلسم کو حقیقت سمجھنے لگے، پھر ان لوگوں نے حضرتِ معاویہ کا برسر منبر اور عین خطبوں میں علی مرتضیٰ ؑ پر سب و طعن کرنا اور تا دیر اس سلسلہ کا قائم رہنا تصنیف کر لیا اور تمام ملتِ اسلامیہ کو عجمیوں کے ان گھڑے ہوئے افسانوں کا یقین آگیا یہ عجمیوں نے کیوں کیا؟ آپ یہی کہیں گے کہ اپنے مذہب کی حمایت میں۔ تو جناب والا یہ عجم اتنی دور کیوں چلے گئے۔ یہاں تک ان کو چلنے کی کیا ضرورت

تھی؟ وہ سرے ہی سے کیوں نہ چلے، انھوں نے یہ کیوں نہ کہہ
دیا کہ غارِ ثور میں آنحضرتؐ کے ساتھ خلیفۂ اول نہ تھے کوئی اور
تھا، وہ تہمت جس کی نفی قرآن نے کی ہے اس سے مراد
حضرت عائشہ نہیں کوئی اور ہیں۔ حضرتِ عائشہ کو (معاذاللہ)
نبیؐ نے علیؑ کے کہنے سے طلاق دے دی تھی اس لیے
وہ علیؑ کی دشمن ہو گئی تھیں۔ یہ دشمنی جنگِ جمل کا سبب ہوئی۔
پھر ان لوگوں نے یہ تسلیم ہی کیوں کیا کہ رسولؐ کے بعد خلیفہ ہوئے
حضرت ابوبکر پھر حضرت عمر پھر حضرت عثمان۔ اسکی بجائے
یہی کیوں نہ کہا کہ علی مرتضیٰ ہی پہلے دن سے باقتدار خلیفہ
ہوئے اور آخر دم تک خلافت کرتے رہے۔ آج تک
شیعوں سے اس کا جواب طلب کیا جاتا ہے کہ اگر خلافت
علی کا حق تھا تو انھوں نے جنگ کیوں نہ کی۔ اگر عجمی سازش
والے منافقین کے بکثرت قتل کیے جانے کو چھپا سکتے تھے اور
جنگِ جمل و صفین وغیرھما کو تصنیف کر سکتے تھے تو ان کو
کیا مشکل تھی کہ وہ علی مرتضیٰؑ کا خلیفۂ اول و ثانی سے قتال

کرنے کا گرما گرم واقعہ بھی تصنیف کر کے شیعوں کو اعتراض مذکور
کے جواب سے سبکبار کر دیتے کہ پھر کوئی یہ سوال ہی نہ اٹھا
سکتا لیکن جن چیزوں کا کوئی وجود ہی نہ تھا وہ تاریخ میں
آتیں کیسے اور اگر آتیں تو کوئی نہ کوئی مردِ خدا پیدا ہو کر
ترکی بہ ترکی جواب دے کر تردید کر دیتا۔ یہ کرامات تو آج
کل کی ہے کہ جو صحیح واقعات ہوں ان کو افسانہ کہا جائے
اور جو من گھڑت اور بے حقیقت دماغی اختراع ہو (کہ نبیؐ
نے چن چن کر ایک ایک منافق کو قتل کر دیا تھا یا اپنے قلمرو
سے نکال دیا تھا) اس کو واقعہ اور قرآنی واقعہ قرار دیدیا جائے۔

بلاغ القرآن اگست ۶۷ء کا جواب کیوں لکھا گیا؟

رسالہ مذکور میں تحفظ ناموس صحابہ کے نام سے جو مقالہ
تھا اگر وہ مقالہ مسلک اہلسنت کے مطابق ہوتا تو مجھے
اسکے جواب کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ مقالۂ مذکور اگر

سنی شیعہ دونوں کے بھی خلاف ہوتا مگر قرآنِ کریم پر اسکی زد نہ ہوتی اور آیاتِ قرآن کو مجروح نہ کیا گیا ہوتا تب بھی میں کچھ نہ کہتا لیکن میں نے دیکھا کہ قرآنِ کریم کی پیروی کے بجائے خود قرآن کو اپنے طبعزاد اور من گھڑت نظریات کا پیرو بنایا جارہا ہے۔ یہ تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں کہ مضمون طراز کسی ناواقفیت اور نافہمی سے ایسا نہیں کر رہے بلکہ سب کچھ جان بوجھ کر دیدہ و دانستہ ہر چیز کے زیر و زبر کرنے کا ان کو شوق پیدا ہو گیا ہے جس میں وہ لطف محسوس کر رہے ہیں لہٰذا ایسی صورت میں خود ان کو سمجھا کر ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرنا یہ کوشش تو بالکل بے کار ہے لیکن خطرہ تو اس کا ہوا کہ کہیں قرآن کا نام دیکھ کر اور مضمون مخاطب میں آیاتِ قرآنیہ پڑھ کر مسلمان اسی طرح بیراہ اختہ نہ ہو جائیں جیسے کہ پہلے بھی کبھی ہو چکا ہے لہٰذا یہ ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کو ہوشیار کر دیا جائے کہ بلاغ القرآن کے نام کی طرح ان کے مضامین مذکورہ میں بھی قرآن سے صرف برائے نام

ورنہ ہر مقصد ہے قرآنِ کریم کے سراسر خلاف اور جب کوئی قرآن کے خلاف ہے تو قرآن اس کے خلاف ہے۔

فاضل مخاطب کا حیاتِ شہداء سے انکار انکارِ قرآن ہے

اسی رسالہ مذکورہ اگست ۶۷ء میں کسی جگہ مقتولین فی سبیل اللہ کی زندگی سے صاف انکار تھا اور کہا گیا تھا کہ آیتِ قرآنیہ میں جو شہداء کے لیے لفظِ احیاءٌ ہے اس کے معنیٰ "زندہ ہیں" یہ نہیں ہے بلکہ احیاءٌ کے معنیٰ ہیں مردہ قوموں کو زندہ کرنے والے ورنہ قیامت تک ان کی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو مردہ کہنے سے صرف احتراماً روکا گیا ہے۔ جیسے کہ ذبیحہ کو مردہ نہیں کہا جاتا۔

اس چیز کو دیکھ کر میرا یہ خیال راسخ ہو گیا کہ صاحب مضمون کو اصل میں صحابہ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے بلکہ ان کی طبیعت میں محبت کو نسبت اور نسبت کو محبت کرنا پیدا ہو گیا ہے

اگر وہ صحابہ کے حقیقتاً شیدائی ہوتے تو وہ شہداء کی حیات جسکو
قرآنِ کریم نے واضح طور پر ثابت کیا ہے اس سے انکار نہ فرماتے
کیونکہ اسلام میں پہلے شہداء تو صحابہ ہی ہیں۔ آیات کا بیان کیا
ہوا اولین شرف تو صحابہ ہی کے لیے ہے جس ہاتھ میں علم
ہے تحفظ ناموسِ صحابہ کا اسی ہاتھ میں تلوار علم کیے ہوئے ہیں صحابہ
شہداء کی زندگی کے خلاف۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ
مخاطب جلیل کو جو کچھ بھی لگاؤ ہے صرف ان نام نہاد صحابہ
سے ہے جو طلقاء اور مولفۃ القلوب کے القاب سے ملقب ہیں
جو خدا کی راہ میں جان دینا کیا الٹا انھوں نے اپنی دنیا کے
لیے مومنین کی جانیں بہت کچھ لی ہیں جو شہید نہیں ہوئے
بلکہ شہید کرتے رہے۔ اس بناء پر میں نے سادہ لوح مسلمانوں کو
ہوشیار کرنے کے لیے جواباً ایک مقالہ سپردِ قلم کیا جسکو
ادارہ پیامِ عمل نے "صحابیت کا قرآنی تصور" سے موسوم کر کے
شائع کیا۔ چونکہ مخاطب موصوف کے نیزۂ قلم سے کتاب
خدا، سنی شیعہ سب ایک ساتھ مجروح ہو رہے تھے۔ اس

لیے یہ ضروری سمجھا کہ ہماری تحریر سنی شیعہ مباحث و اختلافات
سے بلند ہو کر اس ہموار سطح پر رہے جو دونوں فرقوں کی طرف
سے ایک قدرِ مشترک ہو چنانچہ ہم نے اپنے کتابچہ صحابیت کا
قرآنی تصور میں سنی شیعہ بحث کو ہوا تک نہیں لگنے دی
لیکن ہمارے مخاطب کو ہمارا یہ انداز کھل گیا اور انھوں نے
میرے کتابچہ مذکورہ کے جواب میں "تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر" لکھ کر
پورا زور اس پر دیا کہ مسائل زیرِ بحث کو تو گڑبڑ کر چھوڑ دیا جائے
اور اسکی جگہ سنی شیعہ بحث کا دروازہ کھل جائے۔ چنانچہ
لکھتے ہیں :—

"یہ ضمیمہ (صحابیت کا قرآنی تصور) کیا ہے، روایتی
فرقہ بندانہ منافرت کا مرقع، دشنام اور سب و شتم
کا مجسمہ" (تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص ۳)

"شیعی مجلہ "پیامِ عمل" کے ضمیمہ "صحابیت کا قرآنی
تصور" پر تبصرہ" (تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص ۵)

"ایک فرقہ عزاداری کو عبادت قرار دیتا ہے اور

دوسرے فرقہ کے اس سے نکاح ٹوٹ جاتے ہیں۔"

(تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص۵)

"الاعتصام نے ۳ نومبر ۶۷ء کی اشاعت کے ص۱۲ پر تحقیق حدیث انا مدینۃ العلم کے عنوان سے کالم ایک سطر ۲۸ پر لکھا ہے: شیعہ کی پیش کردہ حدیث انا مدینۃ العلم وعلیؑ بابھا حد درجہ ضعیف ہے۔" (تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص۱۲)

"شیعہ حضرات حضرت علیؑ کو معصوم ثابت کریں۔" (الاعتصام) (تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص۱۳)

"حضرت معاذ کی تعلیم حضرت علیؑ کی تعلیمات سے بڑھ کر تھی۔" (الاعتصام) (تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص۱۳)

"حضرت ابوبکر حضرت علیؑ سے افضل تھے۔" (الاعتصام)

(تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص۱۳)

"حضرت ابوہریرہ حضرت علی سے افضل تھے اس میں اختلاف ہے کہ حضرت علیؑ کو پورا قرآن

یاد تھا یا نہیں۔" (الاعتصام) (تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص۱۳)

"لیکن ان تینوں کو (اصحابِ ثلاثہ کو) شیعہ کتابیں مومن نہیں بتاتیں۔" (تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص۱۳)

"آپ دیکھ چکے ہیں کہ (شیعہ نے) ان صحابہ کو مطلقاً ایمان سے خارج بتایا گیا ہے جو ان کی اپنی تاریخوں کی رو سے سریر آرائے خلافت ہوتے تھے۔ العجب"

(تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص۱۵)

"مخاطب موصوف نے اختلاف قرآت قرآن کا مسئلہ چھیڑ کر شیعیت کا مذاق اڑایا ہے حالانکہ قراء سبعہ کا اختلاف قرآت سب کے سامنے ہے اور ان قراء سبعہ میں ایک بھی شیعہ نہیں ہے۔"

(تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص۱۸ و ۱۹)

مخاطب موصوف نے مسئلہ تقیہ کا ضمناً ذکر فرما کر تحقیرِ مذہب شیعہ کی کوشش کی ہے حالانکہ تقیہ سراسر قرآنی موقف ہے۔ (تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص۱۹)

مخاطب موصوف نے خلافت کا وعدۂ خداوندی کے عنوان سے مسئلۂ خلافت کو بڑے زور شور سے چھیڑا ہے جبکہ ہم نے اپنے کتابچہ میں اس مسئلہ کو اور مذکورۂ بالا مسائل کو چھوا تک نہیں۔

(تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص ۲۱)

پھر فرماتے ہیں :-

"تاریخ کے مطابق حضرت علیؑ کی چند سالہ اور حضرت حسنؑ کی چند ماہ کی پریشان خلافت کے علاوہ باقی کسی (امام) کو خلافت میسر ہی نہیں آئی" (تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص ۲۲)

"اور اصحابِ ثلثہ کو مطعون کرنے کے لیے روایاتِ منسوب کا سہارا لیا گیا ہے" (شیعہ مراد ہیں)

(تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص ۲۶)

"کیا خلافتِ ثلثہ پچانوے فیصدی مسلمانوں کا تواتر نہیں، پھر آپ اس تواتر کی مخالفت کیوں

کرتے ہیں۔" (تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص ۴۴)

مخاطب محترم نے حدیثِ قرطاس اور قول حسبنا کتاب اللہ کو چھیڑ کر شیعہ، سنی آویزش کو ہوا دینے کی کوشش فرمائی ہے :-

(تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص ۵۳)

پھر فرماتے ہیں :-

"ہوسکتا ہے کہ مخاطبین یہ اعتراض اٹھائیں آنحضورؐ نے (منافقین کو ختم کرنے کی) کوشش فرمائی تھی لیکن اس کے باوجود وہ لوگ رہ گئے تھے جنہوں نے خلافت پر ناجائز قبضہ جما لیا۔"

(تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص ۵۴)

"اثنا عشری مسلک کو امت کے اولین اجماع متعلقہ خلافت ہی کا انکار ہے۔"

(تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص ۶۴)

ہمارے فاضل مخاطب نے نئے محاذ کھولنے کی تدبیر کیوں کی؟ اور کہاں سے سیکھی؟

ہمارے نئے کتابچہ "صحابیت کا قرآنی تصور" میں شیعہ سنی بحث کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ کتابچہ مذکورہ میں بحث کی گئی تھی۔ حیاتِ شہداء پر یا ضمناً حیاتِ نبی پر یا اس پر کہ عہدِ نبی کے مسلمان جہاں صادق القول اور دل سے مومن تھے وہاں بے دلی سے نبوت کا ظاہری کلمہ پڑھنے والے منافق بھی تھے اور وہ بھی تھے کہ جن کے دلوں میں نبوت پر یقین نہ تھا بلکہ وہ تذبذب اور شک میں تھے جن کی قرآن نے مذمت کی ہے۔ یا ایک بحث اس امر کی تھی کہ صحابیت کا جو مفہوم اس وقت رائج ہے یہ قرآنی مفہوم نہیں ہے۔ اس لفظ کی ایجاد اور اشاعت ان لوگوں نے کی جن کو قرآن کے مستعملہ الفاظ یعنی سابقین، اولین، مہاجرین، انصار، امہات المومنین، اہل البیت میں سے کوئی لفظ اپنے لیے

میسر نہ آسکا تھا اور مقصود تھا ان کو بڑے سے بڑے طبقہ سے برابری کرنا۔ یہ کچھ تھا ہمارے کتابچہ "صحابیت کا قرآنی تصور" کا راس المال ظاہر ہے کہ یہاں سنی شیعہ کوئی بحث ہی نہ تھی لیکن ہمارے مخاطب محترم نے جب یہ دیکھا کہ کتابچہ کے ثابت کردہ نظریات کی تردید تو ہو ہی نہیں سکتی۔ اپنی اس کمزوری اور بے بسی کو دیکھ کر موضوع بحث سے الگ سنی شیعہ بحث کے محاذ وہ بھی ایک دو نہیں صدہا کھول دیئے تاکہ وہ ہماری اور ناظرین کی توجہ منتشر کر کے اپنی کمزوری پر پردہ ڈال دیں۔ اب رہا یہ کہ بہت سے نئے محاذ کھولنے کی تدبیر موصوف نے کہاں سے سیکھی۔ اس کو ہم واضح کرتے ہیں مخاطب عزیز نے اپنے نمبر ۳۰ پر ہند و پاک جنگ اور میجر عزیز بھٹی کا کارنامہ بیان فرمایا ہے حالانکہ ان کے نزدیک میجر عزیز بھٹی ہوں یا ملک وملت کی دوسری قربانیاں یہ سب روز قیامت تک ذبح کی ہوئی مرغی اور بکری سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ موصوف نے

تمام شہداء کو ذبح کی ہوئی مرغی، بکری کی طرح مردہ کہکر سب
کو نسیتی کی بھٹی میں جھونک دیا بیان کی ہوئی جنگ کے
بارہ میں موصوف کو اتنا یاد رہ گیا کہ بھارت نے جب یہ دیکھا
کہ کشمیر میں ہم پیر جما کر نہیں لڑ سکتے۔ اب کشمیر ہمارے ہاتھ
سے چلا تو اس نے اپنی ناکامی دیکھ کر ہماری توجہ منتشر کرنے
کے لیے جا بجا مختلف محاذ جنگ کھول دیئے مگر ناکامی کا
منہ ہر جگہ دیکھنا پڑا) اسی طرح موصوف نے جب یہ دیکھا
کہ کتابچہ صحابیت کا قرآنی تصور، اس کا جواب تو انکے بس
کا روگ نہیں، کتابچہ کی ایک ایک بات صریح اور صحیح ہے
تو اب اعتراف شکست کے بجائے سنی، شیعہ، بحث کا تماشا
دکھا کر لوگوں کو اصل بحث سے غافل کردیں۔ لیکن ہم ان کی
یہ مراد پوری نہ ہونے دیں گے۔ سنی شیعہ بحث کے لیے پورا
دفتر موجود ہے جس کو دیکھنا ہو دیکھے۔ کتابچہ صحابیت کا
قرآنی تصور" کو اس بحث سے کوئی تعلق نہیں البتہ کارکنان "پیام عمل"
کو اور دنیائے شیعیت کو اس امر پر مبارکباد دیتے ہیں کہ ہمارے

فاضل مخاطب نے ہماری کسی کوشش کے بغیر موقف شیعیت یعنی
مسئلہ امامت اثنا عشر کو ایک ہلکا سا پردہ رکھ کر جو تقویت پہنچائی
ہے ہم اس کے لیے اللہ کے شکر گزار اور اپنے مخاطب کے
ممنون ہیں۔ اللہ نے چاہا تو وہ دن بھی دور نہیں کہ ہم اور
موصوف اعتراف عصمت و طہارت کے ایک رشتہ میں منسلک
ہو کر گلے مل لیں۔ ناظرین کو حیرت ہو رہی ہوگی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں
اچھا اب آپ تحفظ ناموس صحابہ نمبر کا ص۲۱ ملاحظہ فرمایئے
تحریر فرماتے ہیں:۔

خلافت کا وعدہ خداوندی

"باقی رہا خلافت کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے جماعت
رسول کے ساتھ بالفاظ قرآن وعدہ فرمایا تھا۔"

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ
الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی
ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا

يعبدونني لا يشركون بي شيئاً، ومن كفر بعد ذالك فاولئك هم الفاسقون ۔ (مفہوم)

اللہ نے تم میں سے ان افراد کے ساتھ وعدہ کیا ہے جو ایمان لائے اور صالحیت کے کام کیے کہ انھیں ضرور ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسے کہ ان سے پہلوں کو زمین کے خلیفے بنایا تھا ۔ اور اللہ ضرور ضرور ان کے لیے ان کے دین کو جسے اس نے خود پسند فرمایا ہے تمکن عطا فرمائے گا اور ضرور ضرور ان کے خوف کو امن میں تبدیل کر دے گا وہ میری فرماں برداری کریں گے اور میرے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہیں بنائیں گے ۔ اور اس خلافت ارضی کے قائم ہو جانے کے بعد جو نافرمانی کرینگے وہ حدود شکن فاسق ہوں گے ۔ صحابۂ رسولؐ کے ساتھ اس آیت مجیدہ میں تین وعدے کیے گئے ہیں (۱) خلافت ارضی کا (۲) تمکین دین کا اور (۳) خوف کو امن کے ساتھ بدل دینے کا

(تحفظ ناموس صحابہ ص ۲۱)

اس کے بعد موصوف نے یہ دکھایا ہے کہ یہ تینوں

وعدے شیعوں کے ائمہ اثنا عشر کے حق میں پورے نہیں ہوئے اور جا بجا یہ بتایا ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ وعدہ کسی سے ہو اور پورا کسی سے ہو اور اس طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو حضرات خلیفہ ہوئے جن کو اقتدار حاصل ہوا، جنھوں نے امن کے ساتھ بغیر کسی خوف کے خلافت کی، وعدۂ خلافت ان ہی حضرات سے تھا ۔

اب ہماری سنیے ۔ موصوف نے جو ہلکا سا پردہ رکھا ہے ہم اسکو اٹھائے دیتے ہیں ۔ موصوف کا منشاء بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ سب باتیں مجھ ہی سے نہ کہلواؤ ۔ کچھ میں کہوں اور جو کچھ کسر باقی رکھوں اس کو تم پورا کر دو ۔

موصوف کا یہ جملہ ہم پھر نقل کرتے ہیں:

"رہا خلافت کا معاملہ، خدا تعالیٰ نے جماعت رسولؐ کے ساتھ بالفاظ قرآنی وعدہ فرمایا تھا۔"

پھر لکھتے ہیں:-

"صحابۂ رسولؐ کے ساتھ اس آیتِ مجیدہ میں
تین وعدے کیے گئے ہیں۔"

پہلے جملہ میں تھا کہ وعدۂ خلافت جماعتِ رسولؐ
کے ساتھ تھا۔ یہاں صاف لفظ صحابہ فرماتے ہوئے کچھ حیا
آئی تھی۔ پھر وہ شرم اتار کر دوسرے جملہ میں لفظ صحابہ لکھ ہی
دیا، کیوں؟ اس لیے کہ اگر شیعوں کا پہلا امام کسی نہ کسی طرح
اس وعدہ میں آ بھی جائے تو باقی ائمہ اہل بیتؑ کے لیے راستہ
بالکل بند ہو جائے۔ وہ کسی طرح اس وعدہ میں آ ہی نہ سکیں
کیونکہ وہ صحابہ نہیں ہیں۔ دوسرا فائدہ صحابہ کی تخصیص سے
غالباً یہ اٹھانا ہوگا کہ جو لوگ ننگِ زماں اور رسوائے عالم
یزید، ولید وغیرہما خلیفہ ہوئے ان کے باب میں کہا جا سکے
کہ وہ چونکہ صحابہ نہ تھے اس لیے اللہ کے وعدے سے وہ خلیفہ نہیں
ہوئے۔ حالانکہ موصوف نے یہ نہ دیکھا کہ یہاں دو ہی شکلیں نکلتی
ہیں۔ یا تو وعدۂ خلافت ان بدنام لوگوں سے بھی تھا تو اس
صورت میں صحابہ کی تخصیص کی کوشش ناکام ہو گئی۔ یا یہ کہ

اللہ کا وعدۂ خلافت ان لوگوں سے نہ تھا مگر یہ خلیفہ بن بیٹھے
تو اس صورت میں یہ طے ہو گیا کہ یہ بات عین ممکن ہے کہ
وعدۂ خلافت ہو کسی اور سے اور بن بیٹھے کوئی دوسرا۔ اور اگر یہ
کہا جائے کہ یہ لوگ خلیفہ نہ تھے۔ بادشاہ اور ملوک تھے تو خلافت و
ملوکیت کا امتیاز جس کے لیے آپ کو محترم مودودی صاحب
سے شکایت ہے اس کو آپ نے خود مان لیا۔ بہر حال میں
آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آپ نے آیتِ مجیدہ مذکورہ
سے یہ کہاں سے اور کس لفظ سے سمجھ لیا کہ یہ وعدۂ خلافت صحابہ
سے ہے۔ کیا لفظ صحابہ یا صحابہ کی طرف نشاندہی کرنے والا
کوئی لفظ آیت میں ہے؟ ہرگز نہیں۔ جب کسی ایسے لفظ
کی موجودگی کے بغیر آپ اس وعدہ کی صحابہ سے تخصیص کر
سکتے ہیں تو کیا شیعہ اس وعدہ کی تخصیص اہل بیتؑ سے نہیں
کر سکتے؟ اگر آپ یہ فرمائیں کہ وعدے کیے جانے والے حضرات
کو آیت نے اٰمنوا اور عملوا الصالحات کہہ کر صیغۂ ماضی
میں بیان کیا ہے اور اس ماضی کے صیغہ سے آپ نے صحابہ

کی تخصیص سمجھ لی اور آپ کے نزدیک یہ بات بنی کہ جو لوگ
مومن اور نیک ہو چکے تھے وعدہ ان سے ہوا اور جو لوگ
آئندہ اوقات میں مومن اور نیک ہوں گے۔

ان سے یہ وعدہ نہ ہوا تو پھر یہ بھی کہیے کہ قرآن مجید
نے جس قدر بھی احکام یا ایہا الذین آمنوا کہہ کر
دیئے ہیں وہ سب صرف صحابہ کو دیے گئے ہیں۔ آئندہ اوقات
کے مومن ان احکام کے محکوم نہیں ہیں جیسے یا ایہا الذین
آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر
منکم۔" اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو
اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اور اولی الامر کی جو تم میں سے
ہیں۔" کہہ دیجیے کہ اللہ، رسول، اولی الامر کی اطاعت
صرف صحابہ پر فرض ہے۔ بعد کے مسلمانوں پر نہیں۔ کیا یہی
سمجھ کر آپ ان اطاعتوں سے دست بردار ہو رہے ہیں۔ افسوس،
لیکن اگر اللہ، رسول، اولی الامر کی اطاعت صرف صحابہ پر ہے
تو اس کے معنی خود بخود یہ ہو گئے کہ صحابہ خود اولی الامر نہیں

بلکہ وہ تو اولی الامر کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ اگر آیۂ استخلاف
میں آمنوا اور عملوا الصالحات کے صیغۂ ماضی ہونے کی
وجہ سے خلافت کا وعدہ صرف صحابہ سے ہے تو سورۂ عصر
میں فرمایا جا رہا ہے وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ
اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا
بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔" عصر کی قسم انسان خسارہ
میں ہے سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیکیاں
کیں اور حق اور صبر کی وصیت کی۔" یہاں آمنوا، عملوا،
تواصوا یہ سب صیغے ماضی کے ہیں۔ یہاں بھی کہہ دیجیے کہ
اُخروی نجات صرف صحابہ کے لیے ہے بعد والی ساری امت
مسلمہ خسارہ میں ہے اور قیامت تک کے سب مومنین دوزخی ہیں
(پناہ بخدا) اگر آمنوا اور عملوا الصالحات سے صحابہ
کی تخصیص ہو گئی تو خود آپ کا حشر کیا ہوگا؟ اور اگر یہ فرمائیں
کہ ہم نے صرف آمنوا اور عملوا الصالحات سے صحابہ
کی تخصیص نہیں سمجھی بلکہ وعدۂ خلافت والی آیت میں ہے

مِنْکُمْ (تم میں سے) یہ ضمیر خطاب اور ضمیر حاضر ہے
اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ وعدہ صرف صحابہ سے
ہے کیونکہ وہی حاضر تھے تو جناب والا قرآن نے اپنے صدہا
احکام میں خطاب اور حاضر ہی کے صیغے استعمال کیے ہیں۔
کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ
مِنْ قَبْلِکُمْ "تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح
کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے۔ وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ
وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ۔ اللہ غنی ہے اور تم نادار ہو۔ وَمَا
اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔ تم کو علم نہیں دیا
گیا مگر تھوڑا۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ۔ نماز کو قائم
کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ
وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ اطاعت کرو اللہ کی، اور
اطاعت کرو ان کی جو تم میں سے رسول اور اولی الامر ہیں۔
قُلْ لَّا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی
رسول کہہ دو کہ میں تم سے تبلیغ پر سوائے محبت اہل بیت کے

کے اور کچھ نہیں مانگتا۔ تو اب فرما دیجیے کہ یہ سب احکام صرف
صحابہ کے لیے ہیں۔ آئندہ مسلمانوں پر نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج،
اطاعت خدا و رسول و امراء کچھ بھی نہیں۔ افسوس کہ آپ
نے وعدۂ خلافت میں صحابہ کی تخصیص کر کے قرآنی احکام اور
قرآنی بشارتوں کو حرف غلط قرار دے دیا۔ کیسے کہ آپ کا
بنایا ہوا یہ قلعہ کہ وعدۂ خلافت صحابۂ رسول سے ہوا تھا ڈھ
گیا یا مسمار ہوا۔

اس کے بعد آپ لکھتے ہیں:۔

"اس آیت مجیدہ میں تین وعدے کیے گئے ہیں۔
(۱) خلافت ارضی کا (۲) تمکین دین کا اور (۳) خوف کو امن
کے ساتھ بدلنے کا۔"

صرف ان تین کا آپ کو نظر آنا اور وہ چوتھا جس نے
وعدہ کیا ہے کہ وہ خود خلیفہ بنائے گا اس کا نظر نہ آنا کیا یہ
بھی کسی عقیدت کی بنا پر ہے۔ ہم کو اس آیت میں تین ہی
نہیں بلکہ سات چیزیں نظر آ رہی ہیں (۱) اللہ خود خلیفہ بنائے گا

(۲) جیسے کہ وہ پہلے حضرات کو خلیفہ بنا چکا ہے (۳) اور ان
کے لیے ان کے اس دین کو تمکین دے گا جس دین کو اللہ
نے ان کے لیے پسند کیا ہے (۴) ان کے خوف کے بعد ان کے
خوف کو امن سے بدل دے گا۔ (۵) وہ صرف میری فرمانبرداری
کریں گے اور کسی شے کو میرا شریک نہ کریں گے (۶) کچھ لوگ
اس خلافتِ حقہ کے قائم ہونے کے بعد اس خلافت کے
منکر ہوں گے (۷) یہ انکار کرنے والے فاسقین ہوں گے
(سورۂ منافقون میں اللہ تعالیٰ نے فاسقین کہا ہے منافقین
کو) اب ہم کو ان ساتوں امور کے متعلق بیان کرنا ہے۔
میرے محترم مخاطب نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ جس
خلافت کا وعدہ اس آیت میں ہے اس سے مراد رسول
کی جانشینی اور امیر المومنینی ہے۔ یہ بھی تسلیم کر لیا ہے کہ اللہ
نے پہلے جن کو خلیفہ بنایا ہے ان خلیفوں سے مراد انبیاء
سلام علیہم ہیں۔ تمکینِ دین سے مراد ہمارے مخاطب کی ہے
غلبۂ اقتدار، حکومت۔ بہت اچھا ہم یہی مانے لیتے ہیں۔

اب ہم ان ساتوں چیزوں کی تفصیل کرتے ہیں۔

۱- اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ خود خلیفہ بنائے گا اور خود
خلیفہ بنانے کے لیے مزید توضیح کر دی۔ یہ فرما کر کہ جس
طرح پہلے حضرات کو اللہ نے خلیفہ بنایا تھا اور یہ
ظاہر ہے کہ اللہ نے کسی وقت اور کسی مرحلہ میں بھی
قراردادِ خلافت کے لیے نہ کبھی کسی سے رائے لی
نہ کسی کی رضامندی پر نظر کی بلکہ جب خلافت کے
ابتدائی مرحلہ پر معصوم فرشتوں نے اَتَجْعَلُ فِيهَا
مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ کہہ کر
ایک حد تک رائے زنی کی تھی تو خداوندِ عالم نے
إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ کہہ کر ان کو خاموش
کر دیا تھا اور فرشتوں کو بتا دیا تھا کہ تمہارا کام صرف
تعمیلِ حکم اور خلیفہ کو مان لینا ہے نہ یہ کہ تم خود کوئی
رائے زنی کرو۔ آدمؑ ہوں یا نوحؑ، ابراہیمؑ ہوں یا
اسمٰعیلؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ ہوں یا یوسفؑ و داؤدؑ

ہوں یا سلیمانؑ، موسٰیؑ ہوں یا عیسٰیؑ، زکریاؑ ہوں یا یحییٰؑ غرضیکہ آدمؑ سے لے کر نبی خاتمؐ تک جس کو بھی خلیفہ بنایا خود اللہ نے بنایا۔ نہ بندوں سے مشورہ لیا نہ کسی کو مشورہ دینے کا حق دیا۔

۴۔ لہٰذا جس طرح قبل میں اللہ تعالیٰ بلا شرکت غیرے خود خلیفہ بناتا رہا ہے بالکل اسی طرح اب بھی وہ خود ہی خلیفہ بنائے گا۔ اللہ اب تک خلیفہ بناتا رہا ہے بنواتا نہیں رہا۔ اب بھی بنائے گا بنوائے گا نہیں اب بتایئے کہ آیت کی یہ پہلی نشان دہی کن حضرات کے حق میں طے پائی۔ کیا ائمہ اثنا عشر کے سوا کوئی اور ہے جس کو بندوں کی رائے سے قدرت نے بے نیاز رکھ کر خود خلیفہ بنایا ہو۔ غیر معصوم انسانوں کو تو خلیفہ بنانے کا کیا حق ہوتا جبکہ موسٰی علیہ السلام نبی ہوتے ہوئے اپنی رائے اور اپنے اختیار سے کسی کو اپنا قوت بازو اور وزیر نہ بنا سکے خدا تعالیٰ

ہی سے عرض کیا کہ تو میرے بھائی ہارون کو جو میرے اہل سے میرا گواہ، میرا وزیر، میرا شریک کار بنا دے۔ امت نے کبھی بھی خلیفہ نہیں بنایا اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ خلیفہ پہلے ہوتا ہے امت بعد میں بنتی ہے نہ یہ کہ امت پہلے ہو اور خلیفہ بعد میں ہو۔ اس کے ساتھ آیت یہ بھی بتا رہی ہے کہ یہ وعدۂ خلافت ہر مومن صالح سے نہیں ہوا کیونکہ منکم کہہ کر بتایا جا رہا ہے کہ وہ مومنین صالحین میں سے مخصوص ہیں جن کی خصوصیت اور انتخاب ایمان اور عمل صالح کے معیار پہ ہے۔ یہ وعدۂ خلافت ان سے ہوا ہے جہاں ایمان و عمل صالح انتہائی درجہ کمال پہ ہو جس کی بنا پر اس صاحبِ ایمان کو کُلِ ایمان کہا جائے اور اب دوسروں کا ایمان نام ہو، اس کی محبت کا۔ اسی طرح جہاں عمل صالح کا کمال ہوگا وہاں جنسِ گناہ کا گزر بھی نہ ہوگا وہاں نیکی میں بدی کی آمیزش نہ ہوگی

اسی کا نام عصمت و طہارت ہے لہٰذا آیت سے جہاں یہ ثابت ہے کہ اللہ بغیر کسی کی رائے زنی کے خود خلیفہ بنائے گا وہاں یہ بھی ثابت ہوا کہ معصومین اور طاہرین کو خلیفہ بنائے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ پاک و پاکیزہ تو قرار دے کسی کو اور خلیفہ بنائے کسی اور کو، اور یہ صورت ہو جائے کہ جن کو اللہ نے پاک و پاکیزہ قرار دیا ان کو خلیفہ نہ بنایا اور جن کو خلیفہ بنایا ان کو اس نے پاک و پاکیزہ نہ قرار دیا۔ صحابہ کے بارے میں خود تحفظ ناموس صحابہ نمبر کے صفحہ سات پر مرقوم ہے۔ "صحابہ کو ہم نے کبھی بھی منزہ عن الخطاء اور معصوم نہیں لکھا۔" پھر جبکہ آپ خود منزہ عن الخطاء اور معصوم نہیں کہتے وہ اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی مکمل تصویر کہاں ہوئے؟ جن سے اللہ نے وعدۂ خلافت کیا ہو۔ البتہ قرآن کریم خبر دے رہا ہے کہ حضرات

اہل البیت وہ ہیں جن سے ہر رجس کے دور رکھنے کا اور جن کی انتہائی تطہیر کا الٰہی ارادہ ہے اور رہے گا۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کی انتہائی پاکیزگی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے لہٰذا یہی حضرات آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی مکمل تصویر و تفسیر ہیں اور ان ہی سے اللہ تعالیٰ کا وعدۂ خلافت ہے۔

۳۔ اب رہی ان کے لیے تمکین دین جس سے آپ نے غلبہ اور حکومت مراد لیا ہے۔ آپ کے پاس ائمۂ اثنا عشر کی خلافت کی مخالفت میں اور موقع پر ہونے والے خلفاء کی موافقت میں یہی دلیل سب سے زیادہ زبردست ہے اور آپ کا پورا زور اور تمام تر ناز اسی پر ہے۔ حالانکہ آیت پہلے ہی فیصلہ کر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ اب بھی اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح اس سے پہلے (انبیاء کو) خلیفہ بنا چکا ہے تو جو انداز انبیاء کی تمکین کا رہا ہے وہی انداز تمکین

کا ان کے لیے ہو گا۔ انبیاء سابقین میں سے
ہر ایک کو غلبہ، اقتدار، حکومت کا موقع حاصل نہیں
تھا۔ تاریخ و حدیث کو اگر بالکل چھوڑ دیا جائے تو
صرف قرآنی شہادتیں بار بار ثابت کر رہی ہیں کہ انبیاء
علیہم السلام عموماً اہل زمانہ کے مظلوم اور مقہور رہے
اور ان کی ساری زندگی مغلوبیت اور مظلومیت میں
گزری: اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا
تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا
كَذَّبْتُمْ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝ "تمہارے پاس
جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشوں کے خلاف
آیا تو تم نے تکبر کیا یعنی اپنے آپ کو ان سے بہتر و
برتر سمجھا پس کسی گروہ انبیاء کی تم نے تکذیب کی اور
کسی گروہ انبیاء کو تم قتل کرتے رہے۔ لم قتلتم
انبیاء اللہ بغیر حق "تم نے انبیاء خدا کو
کیوں ناحق قتل کیا؟ ان القوم استضعفونی

وکادوا ان یقتلوننی۔ جناب ہارون حضرت
موسیٰ سے کہہ رہے ہیں کہ بھائی قوم نے مجھے
کمزور اور ناتواں کر دیا بلکہ قریب تھا کہ وہ مجھے
قتل کر دیں۔ غرض کہ انبیاء کی اکثریت کو تا دم آخر
جھٹلایا جاتا رہا اور ان کو قتل کیا جاتا رہا۔ صرف
معدودے چند نبی ہیں جن کو غلبہ اور اقتدار حاصل
ہوا۔ اگر ہزار میں سے ایک کو اقتدار اور غلبہ ملا، تو
نو سو ننانوے بے اقتدار اور مظلومانہ زندگی گزار کر
چلے گئے لیکن اللہ کے بنائے ہوئے خلیفہ برحق
سب ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی ہونا چاہیے تاکہ سنت
اللہ میں تبدیلی نہ ہو اور اللہ کی فرمائی ہوئی تشبیہ
کما استخلف الذین من قبلھم غلط نہ ہو
اگر یہاں ہر خلیفہ با اقتدار اور با حکومت ہو گا اور کوئی
بھی خلیفہ اپنی پوری زندگی مظلومیت میں نہ گزارے گا
تو آیت صاف کہہ رہی ہے کہ یہ لوگ سابق کے

خلفاء کی طرح نہیں ہیں۔ ان سے اللہ کا وعدہ خلافت نہیں ہے۔ پہلے تو ہزاروں میں سے ایک بااقتدار ہوتا تھا لیکن یہاں جس کو دیکھو ہر ایک بااقتدار ہے جو دلیل آپ کی انتہائی مضبوط سمجھی ہوئی تھی وہ آپ کے انتہائی خلاف اور میرے مسلک کے لیے انتہائی موافق ہے۔ آپ کا یہ فرمانا: "تاریخ کے مطابق حضرت علیؑ کی چند سالہ اور حضرت حسنؑ کی چند ماہ کی پریشان خلافت کے علاوہ باقی کسی امام کو خلافت میسر ہی نہیں آئی" جناب والا! یہی تو دلیل ہے اس امر کی کہ ان حضرات سے اللہ نے اس خلافت کا وعدہ فرمایا ہے جو خلافت پہلے کے انبیاء کو دے چکا ہے۔ اگر انبیاء مظلوم و مقتول ہوتے رہے مگر خلیفہ برحق رہے تو یہ بھی ان ہی جیسے تو ہیں۔ آپ کا یہ جملہ کہ "باقی کسی (امام) کو خلافت (یعنی حکومت) میسر ہی نہیں آئی" آپ نے کس کو کیسے فرمایا۔ امام اور خلیفہ تو بارہ ہیں اور قیامت

ابھی آئی نہیں اور نہ آسکتی ہے جب تک وہ بارھواں نہ آجائے اور اللہ کا وعدۂ تمکین و اقتدار پورا نہ ہو جائے۔ اس آخری امام (مہدیؑ) کو وہ حکومت اور غلبہ اور وہ اقتدار حاصل ہوگا جو نہ اب تک کسی آنکھ نے دیکھا ہو نہ کسی کان نے سنا ہو۔ زمین عدل و انصاف سے بھر جائے گی اور ظلم و جور حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ مشرق سے مغرب تک ان کے دین (اسلام) کا علم سربلند ہوگا۔ اگر آدمؑ کے لیے ملائکہ سربسجود ہوئے تھے تو خاتم الخلفاء (مہدیؑ) کے لیے حضرت عیسیٰؑ اپنے رکوع و سجود میں ان کی اقتداء کریں گے۔ گیارہ امام کی مظلومیت کو دیکھ کر آپ نے یہ کیسے فیصلہ کر دیا کہ باقی کسی کو خلافت (حکومت) میسر ہی نہیں آئی۔ حالانکہ بارھواں باقی ہے، دنیا باقی ہے، وعدۂ تمکین باقی ہے۔ دینِ اسلام کے تمام ادیانِ عالم پر غالب آنے کا وعدۂ خدا باقی ہے۔ آپ مستقبل کی چیز ماضی

ہیں کہیں ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اگر آپ یا کوئی آپ کا
ہم نوا یہ فرمائے کہ وعدۂ تمکین میں تو ضمیر جمع ہے کہ لَیُمَکِّنَنَّ لَهُمْ
وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کے لیے
وعدۂ تمکین نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے لیے ہے تو میں
عرض کروں گا کہ ایک لمحہ کے لیے آیاتِ قرآن پر نظر
فرمائیے۔ خداتعالیٰ نے ہمارے نبیؐ کے عہد میں جو
بنی اسرائیل آنحضور کے سامنے تھے ان کو پکار پکار
کر صیغۂ خطاب میں فرمایا۔ وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ
فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ
اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ وَفِیْ
ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ۔ "اے
بنی اسرائیل ہم نے تم کو آلِ فرعون سے نجات دی
جو تم کو بدترین دکھ پہنچا رہے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو
ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے
اور یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش

تھی۔" حاضر الوقت جن بنی اسرائیل سے خطاب ہے،
نہ یہ فرعون کے زمانہ میں تھے نہ ان کو آلِ فرعون نے
کوئی دکھ پہنچایا تھا نہ ان کے بیٹوں کو ذبح کیا جا رہا
تھا۔ یہ سب تذکرہ ان کے آبا و اجداد کا ہے۔
وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ ہم نے اے بنی اسرائیل تم پر
کوہِ طور کو بلند کیا حالانکہ کوہِ طور حاضر الوقت بنی اسرائیل
پر نہیں بلند کیا گیا۔ یہ ذکر بھی ان کے آبا و اجداد کا
ہے۔ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی۔
"اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر من و سلویٰ نازل کیا۔"
حاضر الوقت بنی اسرائیل پر کوئی من و سلویٰ نہیں اترا
یہ ذکر بھی ان کے آبا و اجداد کا ہے۔ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ
الْعِجْلَ "پھر تم نے گوسالہ بنایا۔" حالانکہ گوسالہ
انہوں نے دیکھا تک نہیں تھا۔ یہ ذکر بھی ان کے آبا و
اجداد کا ہے۔ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا "اے بنی اسرائیل
جبکہ تم نے ایک آدمی کو قتل کیا۔" جس آدمی کے

قتل کا ذکر ہے وہ مقتول آج سے صدہا برس پہلے ان کے آبا و اجداد کا قتل ہوا تھا۔ وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَہْرَۃً۔ "جب تم نے کہا کہ اے موسیٰؑ ہم اللہ کو صاف دیکھے بغیر تم پر ایمان ہرگز نہ لائیں گے۔" وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ۔ "اے بنی اسرائیل جبکہ تم نے کہا کہ اے موسیٰؑ ہم ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے۔" حالانکہ حاضرالوقت بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں تھے کہاں؟ یہ سب ان کے آبا و اجداد کا ذکر ہے لیکن کیا قرآن مجید نے موجودہ قبیلۂ بنی اسرائیل سے سابقہ امور کی نسبت دے کر کوئی غلط بیانی کی ہے ہرگز نہیں۔ کیونکہ حاضرین وقت ہوں یا گزشتگان ان سب کا گھرانہ ایک ہے یہ آپس میں ایک دوسرے کے ہم خیال ہیں۔ ان سب

کے رجحانات ایک ہیں لہٰذا ایک کی بات سب کی بات ہے، اس سے ثابت ہوا کہ ایک گھرانے کے افراد جو باہم ہم خیال ہوں، جو رجحانات میں یکساں ہوں، ان میں سے جو چیز بعض کے بارہ میں ہوگی وہ چیز از روئے قرآن سب کے بارہ میں ہوگی۔ ایک کی حکومت سب کی حکومت ہے۔ ایک کا اقتدار سب کا اقتدار ہے۔ ایک کے لیے تمکین سب کے لیے تمکین کہی جائے گی۔ ایک کے لیے خوف کے بعد امن سے تبدیلی سب کے لیے امن سے تبدیلی ہے۔ مہدئ دین اور ان سے پہلے کے ائمہ یہ تو وہ ایک گھرانہ ہے جو روحانیت میں، نورانیت میں عصمت و طہارت میں امامت و خلافت میں ہر طرح سے ایک ہیں۔ خود آپ نے بھی تو حضرت عیسیٰؑ کی قوم کے غلبہ و اقتدار کو اپنے صفحہ ۲۳ پر خود حضرت عیسیٰؑ کا اقتدار اور تمکن فی الارض قرار دیا ہے حالانکہ خود حضرت عیسیٰؑ

کو اس دنیا میں نہ کوئی غلبہ حاصل ہوا نہ کوئی اقتدار
وہ تو انتہائی مغلوب و مظلوم رہے اور غلبہ و اقتدار
حاصل ہوئے بغیر اٹھا لیے گئے۔ اب اگر ان کے متبعین
ان کے بعد غالب آ گئے بقول آپ کے "ہم نے
دشمنوں کے مقابلہ پر مومنوں کی مدد کی اور وہ غالب
آ گئے" اور اس طرح یہ غلبہ خود حضرت عیسیٰؑ کا غلبہ
قرار پا گیا۔ یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ انبیاء
میں سے غلبہ صرف معدودے چند حضرات کو ملا ہے
لیکن قرآن مجید نے ان معدودے چند انبیاء کے
غلبہ کو کل انبیاء کا غالب آنا قرار دے کر فرمایا ہے۔
کتب اللہ لاغلبنّ انا و رسلی انّ اللہ
قویٌّ عزیزٌ ○ "اللہ نے کہہ دیا ہے کہ میں
اور میرے مرسلین ضرور ضرور غالب آئیں گے
یقیناً اللہ قوی اور غالب ہے۔"

۴۔ اس کے بعد آیت میں ہے۔ ولیبدلنّھم

من بعد خوفھم امنا۔" اور ضرور ضرور
اللہ ان کے خوف کو امن سے بدلے گا۔ اس جملہ سے
صاف پتہ چلتا ہے کہ تمکین اور اقتدار حاصل ہونے
تک ان خلفاء کا پورا زمانہ مسلسل خوف و مغلوبیت
میں گزرے گا۔ اور یہ خوف مسلسل اس وقت زائل
ہوگا جس وقت یہ برسر اقتدار آئیں گے۔ اقتدار سے
پہلے نہ خوف زائل ہوگا نہ امن و سکون حاصل
ہوگا۔ اگر اس نکتہ پر توجہ کی جائے تو آپ کے با اقتدار
خلفاء پر یہ بات پوری نہیں اترتی کیونکہ ہر خلیفہ خلافت و
اقتدار حاصل ہونے سے پہلے ہی بے خوف اور امن
میں تھا۔ یہ نہیں کہ خلافت و اقتدار ملنے سے ان کو
امن نصیب ہوا ہو۔ اور اقتدار حاصل ہونے کی گھڑی
تک وہ خائف اور مغلوب تھے کیونکہ اللہ تعالےٰ
کی نصرت اور فتح پہلے ہی آ چکی تھی اور دینِ حقہ
میں افواج داخل ہو چکی تھیں۔ اب یہ کس سے مغلوب

اور خائف تھے۔ یہ نکتہ بھی ائمۂ اہلِ بیتؑ پر پورا
اترتا ہے کیونکہ فتحِ مبین ہو جانے پر بھی وہ جانتے
تھے کہ جو خلافت اور حقِ اقتدار اللہ نے ہم کو عطا
کیا ہے ہم کو اس اقتدار سے محروم رکھا جائے گا
ہمارے گھر پر یورش ہو گی ہم کو گھر جلا دینے کی
دھمکی دی جائے گی اور پھر ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی
طاقت ہمارے مقابل رہے گی اور ہم کو ہر طرح کمزور
کیا جائے گا۔ ہمارے بچے، جوان، بوڑھے تہِ تیغ
کیے جائیں گے۔ ہماری مستورات اور یتیموں پر کوئی
رحم نہ کھایا جائے گا۔ ہم کو قید خانوں میں رکھا جائیگا
لہٰذا وقت سے پہلے بھی خوف اور وقت آنے
پر بھی مصائب و آلام کا سامنا ہو گا۔ یہ ہیں وہ
حضرات جن کی پوری زندگی خوف میں گزری۔ ان کو
امن و سکون اسی ہی غلبہ و اقتدار سے حاصل ہو گا
جس کے وہ اور اہلِ نظر منتظر ہیں۔

اس کے بعد آیت میں ہے:۔
یعبدوننی جس کا ترجمہ آپ نے خود فرمایا
ہے۔ "وہ میری فرماں برداری کریں گے"۔ اب
فرمائیے کہ ا۔ فرماں برداری پوری یا ادھوری؟
ایسی فرماں برداری جس میں نافرمانی کا شائبہ بھی
نہ ہو؟ یا ایسی کہ فرماں برداری اور نافرمانی دونوں
مخلوط ہوں؟ یقیناً فرماں برداری سے مراد ہے
مکمل فرماں برداری۔ خالص فرماں برداری جس
میں نافرمانی کا اختلاط نہ ہو اور یہ صورت اور صفت
صرف معصوم کی ہے غیر معصوم کی نہیں ہو سکتی۔ یہی
ہمارا مسلک ہے۔

۶۔ ۷۔ آخر آیت میں ہے۔ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ اس قرار دادِ
خلافت کے بعد جو انکار کرے گا وہی لوگ فاسق ہیں
اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس قرار دادِ خلافت

سے انکار ہوگا۔ آپ تو اپنے با اقتدار خلفاء کی خلافت
سے کسی کا منکر ہونا تسلیم ہی نہیں کرتے اور یہ دکھانا
چاہتے ہیں کہ ہر خلافت کو ہر شخص نے صمیم قلب سے
مان کر سر تسلیم جھکا لیا تو پھر یہ خبر بھی ائمہ اہلبیتؑ
پر پوری اتری۔ منکرین خلافت کو آیت نے فاسقون کہا
ہے اور سورۂ منافقون میں اللہ نے منافقین کو فاسقین
فرمایا ہے۔ لہٰذا قرار دادِ خلافت کے وقت منافقین
کا وجود قرآن سے ثابت اور ہویدا ہے۔ چاہے
آپ منافق اپنے ہی خلفاء کے منکرین کو فرما دیں
لیکن منافقین کا وجود ہر حالت میں ثابت ہے۔
اس آیت سے ثابت ہے کہ مخصوص مومنین صالحین
سے اللہ نے بالکل اسی طرح خلیفہ بنانے کا وعدہ کیا ہے جس طرح
قبل میں اللہ خود خلیفہ بناتا رہا ہے یہ آیت اس وعدہ کا ذکر
کرتی ہوئی نبیؐ پر اتری اور کم از کم آیت اترنے پر تو نبیؐ کو بھی علم
ہو گیا کہ خلافت کا وعدۂ الٰہی کن لوگوں سے ہے۔ چونکہ مفہوم

آیت کی تبلیغ نبیؐ پر فرض تھی اسی لیے آنحضرتؐ کے لیے ضروری
تھا کہ نزولِ آیت کے بعد ان کو بھی باخبر کر دیں۔ جن سے اللہ
نے وعدۂ خلافت کیا ہے اور امت کے عامۃ الناس کو بھی
مطلع کر دیں جن پر وہ خلیفہ اور حکمران ہوں گے تاکہ ہونے
والا خلیفہ بھی اپنی جگہ مطمئن ہو جائے اور امت بھی اپنی
بے خبری کی وجہ سے "ومن کفر بعد ذالک فاولٰئک
ھم الفاسقون" کی زد میں ناکردہ گناہ نہ آ جائے۔ لہٰذا
مسلمانوں کی تاریخ میں کوئی واقعہ صریحہ ایسا ہونا چاہیے
کہ نبیؐ نے اپنی امت کے مجمعِ عام میں خبر دے دی تھی کہ میرے
بعد وعدۂ خلافت اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص سے کیا ہے
لہٰذا تم دل و جان سے اس کی اطاعت کرنا اور اس کی
اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت سمجھنا۔ لیکن آپ
نے اپنے بااقتدار خلفاء کے لیے ایسا کوئی صریحی واقعہ آج
تک نہ پیش کیا اور کبھی یہ نہ بتایا کہ نبیؐ نے علی الاعلان
وعدۂ الٰہی کی صراحت کی تھی۔ یہ بات کتنی عجیب ہے کہ

اللہ نے آپ کے خلفاء سے وعدہ کیا، ذکر وعدہ کرتے ہوئے نبیؐ پر آیتِ قرآنی نازل کی مگر نبیؐ نے نہ تو ہونے والے خلفاء کو بتایا نہ امت کو مطلع کیا۔ اس صورت میں تبلیغِ رسالت کی کیا حیثیت رہی اور امت کو انتشار و افتراق سے بچانے کی جو بالکل آسان تدبیر تھی اس کو کیوں نظرانداز کر دیا۔ اس طرح تو آپ امت کے انتشار و افتراق کی ساری ذمہ داری نبیؐ پر رکھ رہے ہیں تو کیا خلافت کے سامنے آپ کو رسالت کی فکر نہیں؟ وعدۂ خلافت تو ہوتا اس زور و شور سے کہ آیت کے ہر فعل پر لام تاکید اور نونِ تاکید آ رہا ہے مگر تبلیغ آیت کے لیے نبیؐ کی طرف سے کوئی اہتمام نہیں۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ اگر آپ کوئی ایسا صریحی واقعہ بیان فرما کر نبیؐ کی حیثیت کو محفوظ نہیں کرتے تو ہم یہ بتانے پر مجبور ہیں کہ ہاں اللہ نے وعدۂ پُرتاکید خلافت کے لیے فرمایا۔ آیت نازل کی اور نبیؐ نے بالآخر آخری حج سے فارغ ہو کر واپسی میں ساری امت کو جمع کر کے سنا دیا

کہ من کنت مولاہ فعلیٌ مولاہ۔

ہم مسئلۂ خلافت کو نہ چھیڑنا چاہتے تھے نہ چھیڑنا چاہتے ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے نقطۂ نظر کے لیے بااختیار ہے لیکن ہمارے فاضل مخاطب نے چونکہ آیتِ قرآن سے وعدۂ خلافت پر بے وجہ بحث فرمائی تھی۔ اس لیے ہم نے بادلِ ناخواستہ یہ چند جملے اس لیے لکھے کہ اربابِ نظر یہ دیکھ سکیں کہ حسبی قرآن کو ہمارے مخاطبِ جلیل اپنے ساتھ سمجھ رہے تھے وہ ان کے ساتھ نہیں بلکہ ارشادِ رسولؐ کے مطابق علیؑ مع القرآن والقرآن مع علی۔ آیۂ استخلاف، سے تو سو فیصدی خلافت علی مرتضیٰؑ ثابت ہو رہی ہے، آپ نے اس ہی سے بچنے کے لیے حدیث اور تاریخ کو چھوڑا تھا لیکن کیا اب آپ قرآن کو بھی چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟

تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر میں ہماری کسی ایک بات کا بھی جواب نہیں

ہم نے بلاغ القرآن اگست ۶۷ء کے بعض مضامین کی تردید میں "صحابیت کا قرآنی تصور" لکھا تھا جس کا جواب تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ہمارے پاس پہنچا ہے جس کو ہم نے از اول تا آخر بار بار پڑھا لیکن ہم کو خوشی اور اطمینان ہے کہ ہمارا کتابچہ مذکورہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ چنانچہ مخاطب محترم کے سیاہ کیے ہوئے ۴۰ صفحات میں سے کسی ایک سطر بلکہ کسی ایک جملہ میں بھی ہمارا کوئی جواب نہیں۔ اب ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جواب کے نام سے الفاظ کے بے پناہ پلندے ردی کے گانٹھوں سے بھرے ہوئے گٹھڑ کی طرح ہمارے سامنے رکھ دیئے جن میں اور سب کچھ ہے مگر جواب نہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ الفاظ کی بھرمار سے ایک حامی

محض یہ سمجھ لے کہ بڑا عظیم الشان جواب ہے لیکن ہماری اور ان کی عبارتوں کو مقابلہ پر پڑھا جائے تو ہر شخص کہے گا کہ جس سے جواب نہیں بن پڑتا وہ یوں ہی الفاظ کی لوٹ پھیر کیا کرتا ہے۔

مخاطب محترم کی ہمارے کتابچہ کے پیش لفظ پر تنقید

موصوف نے ہمارے کتابچہ کے پیش لفظ مکتوبہ الحاج خواجہ حبیب علی صاحب پر بڑی طول طویل تنقید فرمائی ہے اور پیش لفظ کے ساتھ اصل کتابچہ کو بھی انداز تکلم و تخاطب کو تعصب، نفرت، تحقیر و استہزاء کو دامن میں سمیٹے ہوئے اخلاق کی حدود سے بے نیاز قرار دیا ہے لیکن ہمارے کتابچہ کے پڑھنے والے ملاحظہ کریں گے کہ ہم نے تہذیب و متانت کو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہمارے لیے انتہائی مشکل مواقع آئے لیکن ہم اذا مرّوا باللغو مرّوا

کی انتہا کے انداز پر گزرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ہمارے
بعض احباب کو شکایت ہے کہ ہم نے پوری اور خاطر خواہ
وضاحت نہ کی لیکن باطلِ محض کو باطل اور غلط بات کو
اگر غلط بھی نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے۔ ہماری نرمیٔ گفتار
کے باوجود بھی اگر کوئی لفظ یا جملہ ناگوارِ خاطرِ محترم ہوا ہو
یا آئندہ ہو جائے تو اس کو ارادہ پر محمول نہ فرمایا جائے۔
جبکہ آپ کے یہاں تو ارادی فعل کو بھی غیر ارادی اور عمداً
عمل کو بھی سہواً قرار دینے کی اور بشریت کے دخل سے بڑے
سے بڑے گناہ کر گزرنے کی معافی گنجائش ہے۔ دیکھیے ص ۱۱
تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ۳۔ اس کے برخلاف موصوف نے
ہمارے لیے جو کچھ بھی نرم گرم تحریر فرمایا ہے ہم کو اس کے
لیے اپنے مخاطب سے کوئی شکوہ نہیں۔ یہ ہمارا وہ خاندانی
ورثہ ہے جو ہمارے آبا رطاہرین سے ملا ہے۔ خداوند عالم
ہم کو حق گوئی اور حق کوشی کی توفیق عطا فرماتا رہے۔ پھر جس
کا جو دل چاہے کہے۔

کتابچہ کے پیش لفظ پر اعتراضی جملے

پیش لفظ میں جملہ حسبنا کتاب اللہ پر جو ضمناً
تبصرہ آگیا تھا مخاطبِ محترم نے اس سلسلہ میں حضرت علیؑ پر
بھی اعتراض جڑ دیا۔ فرماتے ہیں :۔

> "پیامِ عمل" کی مسلمہ روایت ہے کہ آنحضورؐ نے
> قلم دوات طلب فرمائی لیکن حضرت عمرؓ نے
> حسبنا کتاب اللہ کہہ کر اسکی ضرورت نہ سمجھی
> اور حضرت علیؓ سمیت جملہ صحابہ نے اس پر
> صاد کیا جس کا ثبوت یہ ہے کہ بقول تاریخ
> آنحضورؐ اس کے بعد دو تین زندہ رہے لیکن
> کسی نے بھی قلم دوات حاضر کرنے کا اہتمام
> نہ کیا۔"

میں کہتا ہوں کہ اس روایت کا پورا بار اور ساری
ذمہ داری "پیامِ عمل" جیسے ہلکے پھلکے رسالہ ہی پر کیوں ڈال

دی گئی جبکہ صحیح بخاری جیسی [٤٣] ذاتی اور قدیمی ضخیم کتاب اس
روایت کا بار اٹھا رہی ہے - کیا ؛ نزلہ بر عضو ضعیف می ریزد
والا مضمون یہاں بھی ہے - پھر روایت میں یہ کتر بیونت
کیسی کہ حضرت عمر نے حسبنا کتاب اللہ کہہ کر اس کی ضرورت
نہ سمجھی - صاف یہی کیوں نہ فرمایا کہ موصوف نے نبیؐ کے اس
فرمان کو بے حواسی پر محمول کیا - اس کے بعد کا یہ جملہ کہ حضرت
علی سمیت جملہ صحابہ نے اس پر صاد کیا ، یہ سفید جھوٹ نہیں
تو کیا ہے - یہ آپ نے کہاں سے لکھ دیا - صحابہ تو اس
وقت اختلاف اور باہمی تنازع کی حالت میں تھے - بعض
دوات وقلم والے حکم نبیؐ کی تعمیل پر مصر تھے - بعض حضرت
عمر کی تائید میں تھے - نبیؐ نے جب یہ نزاع اور کشمکش دیکھی
تو قوموا عنی لا ینبغی التنازع عندی فرما کر مجلس
کو برخاست فرما دیا - ظاہر ہے کہ آنحضورؐ نے اپنی ناگواری
کا اظہار اس ہی فریق پر کیا جو نبیؐ کے ارادہ کتابت میں
مخل تھے - اب رہا یہ سوال کہ آنحضرتؐ نے اس کے بعد

وہ چیز کیوں نہ لکھی اور علی مرتضیٰ [٤١] اور دوسرے عقیدتمندوں
نے کیوں نہ دوات قلم حاضر کیا ؟ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آنحضورؐ
نے محض دوات وقلم کی نایابی کے سبب سے وہ تحریر
نہ لکھوائی اور سرکار مجبور محض رہے - یہ غلط ہے - دوات و
قلم تو کوئی بھی دے سکتا تھا - اس تحریر کا عمل میں نہ آنا دوات و
قلم کے قحط کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مصلحت
نبیؐ اس تحریر کے مسئلہ سے علی مرتضیٰؑ کو خصوصاً اور اپنے
اہل بیت کو عموماً الگ تھلگ رکھنا چاہتی تھی - اس لیے سرکار
نے دوات وقلم لاؤ ، یہ خطاب نہ علیؑ سے کیا نہ اور کسی اہلبیت
سے - یہ خطاب صرف غیر اہل بیت سے تھا - چنانچہ
نبیؐ کے الفاظ میرے اس بیان کی پوری تائید کر رہے
ہیں - ایتونی بدواۃ وقرطاس حتیٰ اکتب لکم کتابا
لا تضلوا بعدی - یہ روایت تھوڑے سے لفظی اختلاف
سے طبرانی ، صحیح مسلم ، صحیح بخاری ، مسند احمد بن حنبل ،
ملل ونحل شہرستانی ذخیرہا میں موجود ہے - کسی میں دوات اور

کاغذ کا ذکر ہے، کسی میں لوح اور دوات کی طلب کا ذکر
ہے، کسی میں صرف لفظ کتاب ہے یعنی لکھنے کا سامان لیکن
ہر کتاب میں یہ لفظ ضرور ملتا ہے کہ سرکار نے ہونے والے
نوشتہ کے بارے میں یہ فرمایا کہ میرے بعد یا اس نوشتہ
کے بعد تم گمراہ نہ ہو سکو گے۔ یہ جملہ صاف بتا رہا ہے
کہ یہ خطاب اہل بیت سے نہ تھا کیونکہ اہل بیت کی تطہیر
کا اعلان آیۂ تطہیر بھی کر چکا تھا اور خود پیغمبرؐ بھی فرما
چکے تھے کہ میری امت کے افراد جب تک تم قرآن اور
اہلبیت سے وابستہ رہو گے میرے بعد گمراہ نہ ہو گے۔ اس
مشہور حدیث ثقلین سے دو چیزیں ظاہر ہو رہی ہیں ایک
تو یہ کہ اہل بیت دوسروں کو گمراہی سے بچانے والے ہیں لہذا
خود ان کے گمراہ ہونے کا کسی وقت بھی سوال نہیں پیدا ہو سکتا
دوات و قلم ان سے مانگا جا رہا ہے جو گمراہ ہو سکتے ہیں
لہذا یہ خطاب اہل بیتؑ سے نہ تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ
کسی جگہ تو نبیؐ اس امر کی ضمانت کر لیں کہ اہل بیتؑ سے

وابستہ انسان کبھی گمراہ نہ ہو گا اور کسی جگہ نبیؐ اہل بیتؑ
کے خود گمراہ ہونے کا امکان بتلاتے ہوئے ان سے فرمائیں
کہ مجھے سامانِ کتابت دو تاکہ میں تمہارے لیے ایسی چیز لکھ
دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو سکو۔ دوسری بات یہ ہے
کہ حدیثِ ثقلین کے یہ لفظ کہ وابستۂ اہل بیتؑ کبھی گمراہ
نہ ہو گا اور اس حدیث قرطاس کے بھی آخری یہی لفظ کہ اس
نوشتہ کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے۔ دونوں جگہ کے آخری
جملوں کا یکساں ہونا بتا رہا ہے کہ نوشتہ خود اہل بیتؑ ہی
کے بارہ میں اور ان ہی کے حق میں ہونے والا تھا۔ اس لیے
ضروری تھا کہ آنحضورؐ اس تحریر کے کام سے علی مرتضیٰؑ اور
دوسرے اپنے اہل بیتؑ کو الگ تھلگ رکھیں۔ دنیا
جانتی ہے کہ آنحضورؐ اپنے ہاتھ سے کبھی نہ لکھتے تھے
جس کا ذکر قرآن مجید تک میں ہے تو کیا یہ صورت کوئی
مفید اور مناسب ہو سکتی تھی کہ وہ نوشتہ بھی علیؑ ہی کے
حق میں ہو اور دوات و قلم بھی علیؑ ہی لاکر نبیؐ کی طرف

سے خود ہی لکھنے بیٹھ جائیں؟ یا علیؑ کا کوئی گھر والا
قرابتدار خاص کاتب ہو؟ کاتب کے لیے ضروری ہے
کہ جس کے حق میں وہ کتابت ہو اس کا غیر ہو۔ اس لیے
نبیؐ کا خطاب اپنے اہل بیتؑ سے نہ تھا۔ دوسرے یہ
کہ اس تحریر کا ہو جانا کوئی اصل مقصود نہ تھا کہ کسی نہ
کسی طرح وہ چیز تحریر میں آ ہی جاتی۔ نبیؐ اپنے فرمان کے
بعد یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ قوم اس تحریر کا خیر مقدم کرتی
ہے یا نہیں۔ چنانچہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں دوات، کاغذ
قلم کا کوئی ذکر نہیں بلکہ لفظ یہ ہیں:۔ ھلم اکتب لکم
کتابا لا تضلون بعدہ "آؤ تاکہ میں تمہارے لیے وہ
لکھ دوں کہ جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو۔" آؤ! اس کے معنی
یہی ہیں کہ رضامند اور متوجہ ہو کر لکھا لو۔ لیکن بعض حضرات
نے جب یہی صاف کہہ دیا کہ نبیؐ بے ہوشی میں کہہ رہے ہیں
تو اب وہ کتابت ہو بھی جائے تو اس کا فائدہ کیا رہا؟
جنھوں نے نبیؐ کے سامنے کہہ دیا وہ بعد میں نہ کہہ دیتے

کہ بے ہوشی کی تحریر بھی کوئی چیز ہے؟ جب اس صورت
میں وہ تحریر ہی بے اثر اور غیر مفید ہو گئی تو نبیؐ وہ تحریر لکھا
کر کیا کرتے۔ سرکار نے یہ دیکھ کر کہ لوگ اس تحریر کا خیر مقدم
ہی نہیں کر رہے ہیں اور میرے سامنے ہی اس کو قبول
نہیں کر رہے ہیں اپنا ارادہ تحریر فسخ فرما دیا۔

پیش لفظ پر دوسرا اعتراض

ہمارے کتابچہ کے پیش لفظ میں یہ جملہ تھا۔ "تاکہ
پاکستان میں موسیقی کی جلترنگ، حسن و شباب کی
برق پاشیوں، عریانی اور فحاشی پر ملّا کی طرف سے کوئی
ٹوک نہ رہے مگر اس کے ساتھ مسلمانی میں بھی کوئی فرق
نہ آئے۔"

اس پر مخاطب محترم لکھتے ہیں:۔

یہ بلاغ القرآن پر بہتانِ محض ہے، پیام عمل
کا فرض ہے کہ یا تو بلاغ القرآن کے بارہ سال

کے قائلوں سے موسیقی، فحاشی اور عریانی کی تائید
میں ایک لفظ ہی دکھا دے اور یا اپنے الفاظ
واپس لے کر اپنے اخلاق کا ثبوت مہیا کرے۔"

بلاغ القرآن پر بہتانِ محض تو اس وقت ہوتا جبکہ
"بلاغ القرآن" کو موسوم کر کے ایسا کہا گیا ہوتا۔ مطلب تو
یہ ہے مسلمانوں کو حدیث، تفسیر، فقہ، تاریخ سے بے تعلق
کر دینا ایسی بنیاد ہے کہ جس پر ہر عمارت کو بلند ہونے کا موقع
ہے۔ اس ابتدا کی انتہا جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے۔ ہر شخص اپنا
مطلب نکالنے کے لیے قرآن کا سہارا لینا چاہتا ہے۔ کیا
آپ کو معلوم نہیں کہ موسیقی اور عریانی کے دل دادہ سالہا سال
سے یہ کہہ رہے ہیں کہ غنا کی حرمت دکھاؤ، قرآن میں کہاں
ہے؟ مستورات کے چہرہ کا پردہ دکھاؤ قرآن میں کہاں ہے؟
قرآن میں تو غضِّ بصر کا حکم ہے اور غضِّ بصر تو جب ہی ہوگا
کہ ادھر چہرہ کھلا ہوا ہو۔ قرآنِ کریم میں تو لَا یُبْدِیْنَ
زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ہے۔ یعنی یہ کہ مستورات

اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر جو حصہ خود بخود ظاہر ہے"۔
لہٰذا اگر زینت سے مراد جسم ہے تو چہرہ، ہاتھ، قدم
الا ما ظهر منها سے مستثنیٰ ہو گئے اور اگر زینت سے مراد آرائش
ہے تو جسم اور چہرہ کے چھپانے کا کہیں حکم ہی نہ رہا۔ محض
آرائش اور وہ بھی مخفی آرائش کے نہ دکھلانے کا حکم ہے۔ کوئی کہتا
ہے کہ کتے اور بلی کا قرآن سے حرام ہونا دکھاؤ۔ خود مجھے
ایک ایسے عربی کے فاضل سے واسطہ پڑا ہے جن کا کہنا یہ
تھا کہ میں مانتا ہوں کہ شراب پینا رجس ہے، گناہ ہے، اس
سے اجتناب کا حکم ہے لیکن قرآن نے اس کو حرام نہیں
کہا۔ جس کے لیے مجھے ایک مستقل رسالہ لکھنا پڑا۔ داڑھی
رکھنے کا حکم قرآن میں دکھاؤ۔ عموماً یہ سوال ہوتا ہے۔ ایسے
لوگ قرآن کا محض نام یاد کیے ہوتے ہیں۔ قرآن کی آیات
کو یاد نہیں کرتے کہ قرآن صرف اطیعوا اللہ نہیں کہہ رہا
ہے وہ اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم بھی کہہ رہا
ہے۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے من یطع الرسول فقد

اطاع اللہ۔ جو رسول کی اطاعت کرے گا وہ یقیناً اللہ
کا مطیع ہو گیا۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اے رسولؐ!
یہ ایمان لانے والے مومن نہ ہوں گے مگر اس وقت
جبکہ اپنے باہمی ہر اختلاف کا تم کو حَکَم بنائیں اور جو فیصلہ تم
کرو اس سے دل تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو پورے طور پہ
مانیں۔ اب جب کہ مسلمان رسولؐ اور اولی الامر کا دامن
چھوڑ کر سنی شیعہ دونوں کے ستہ اربعہ (کتب حدیث)
سے دست بردار ہو جائیں تو احتساب کون کرے؟
حساب تو بے باق ہوا۔

سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث سب کو کالعدم قرار دے دیا

محترم مخاطب نے تحفظ ناموس صحابہ نمبر ۲ نمبر
پانچ پر شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث کی تفسیر و
فقہ کا اختلاف دکھاتے ہوئے سب کو کالعدم قرار دینا

جاتا ہے چنانچہ گم شدہ شوہر کی بیوی کو انتظار کرنے کے لیے
امام اعظم اور امام مالک کا اختلاف دکھایا ہے اور اختلاف
کی بنا پر دونوں کا مذاق اڑایا ہے لیکن میرے فاضل مخاطب
بھی تو آخر کوئی رائے قائم کریں گے؟ کہ یہ انتظار کتنی مدت
تک ہو۔ مخاطب کی رائے یا تو ان ہی میں سے کوئی چیز
ہو گی۔ پھر اس چیز کو آپ نے صحیح مان لیا یا آپ کی رائے سب
سے مختلف ہو گی تو جب اختلاف کی بنا پر آپ کے نزدیک
سب غلط ہیں تو اسی اختلاف کی بنا پر آپ کی رائے بھی
غلط ہوئی۔ جب امام اعظم اور امام مالک غلط ہو سکتے
ہیں تو کیا آپ غلط نہیں ہو سکتے؟ ہم آپ سے یہاں کہہ
دیتے کہ چونکہ آپ کے نزدیک آپ سمیت سب غلط
ہیں لہٰذا امام آخر حضرت مہدیؑ کا انتظار فرمائیں، لیکن
مشکل تو یہ ہے کہ آپ امام مذکور تو کجا حضرت محمد مصطفےٰ ص
کو بھی سہو و نسیان، ناقص الاجتہاد اور خطا سے منزہ نہیں
سمجھتے کیونکہ ہمارے کتابچہ "صحابیت کا قرآنی تصور" کے

پیش لفظ میں جناب الحاج خواجہ حبیب علی صاحب نے لکھا تھا۔ "حیرت بالائے حیرت تو یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ لوگ سید الانبیاء، سرکارِ مدینہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے لیے سہو و نسیان، ناقص اجتہاد اور خطا کاری کی نسبت دینے میں جھجک محسوس نہیں کرتے" جناب خواجہ صاحب کی مذکورہ عبارت فاضل مخاطب نے "تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر" میں نقل فرمائی جس سے ہمارا خیال ہوا کہ فاضل مخاطب کم از کم سید الانبیاءؐ سے کچھ شرم محسوس کرتے ہوئے ضرور اس کی تردید فرمائیں گے اور کہیں گے کہ یہ ہم پر بہتانِ محض ہے۔ مگر یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ خواجہ صاحب کی پوری عبارت نقل فرما کر بجائے تردید فرمانے کے اور کوئی لفظ بھی تردید میں لکھنے کے عبارتِ مذکورہ خواجہ صاحب پر صفحہ سات پر نمبر ۶ لگا کر تحریر فرماتے ہیں :۔

"بلاغ القرآن منزہ عن الخطاء محض ذاتِ باری کو مانتا ہے۔"

جس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ جناب خواجہ صاحب کی پوری مذکورہ عبارت آپ کو صمیمِ قلب سے منظور ہے، اور آپکا دلی عقیدہ رسالتمآبؐ کے بارے میں حرف بحرف وہی ہے جس کی نشان دہی خواجہ صاحب نے فرمائی ہے۔ اگر فاضل مخاطب نے خواجہ صاحب کی مذکورہ عبارت نقل ہی نہ فرمائی ہوتی تو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ اس عبارت کو موصوف نے لائقِ اعتنا نہیں سمجھا لیکن عبارت کو نقل فرمانا اور اسکی تردید میں کوئی حرف نہ لکھنا بلکہ نمبر لگا کر اسکی تائید کرنا کہ بلاغ القرآن منزہ عن الخطاء محض ذاتِ باری کو مانتا ہے۔ لفظ سہو و نسیان اور ناقص اجتہاد کی تردید بالکل نہ فرمانا یہ سب چیزیں موصوف کے اس عقیدہ کو جو خاتم النبیینؐ کے لیے ہے عریاں کر رہی ہیں۔ اب جب کہ سیدِ انبیاءؐ تک آپ کے نزدیک سہو و نسیان ناقص اجتہاد اور خطا کاری سے بری نہیں تو امام اعظم اور امام مالک کی کیا حقیقت ہے؟ لیکن آپ کا اجتہاد سیدِ انبیاءؐ سے بھی فائق ہے۔ پھر آپ خدا ہوئے۔ جب امام اعظمؒ

امام مالک حتیٰ کہ سید الانبیاء بھی جائز الخطاء اجتہاد کرنے
والے ہیں تو آپ کا اجتہاد کتنی خطاؤں سے بھرا ہوا ہوگا۔
آپ کا اجتہاد کہیں یہ بتائے گا کہ شہداء عام انسانوں بلکہ
جانوروں کی طرح قیامت تک مردہ ہیں۔ روح کوئی چیز ہی نہیں
جو کچھ کرتا ہے یہ مٹی کا جسم کرتا ہے ایک ایک منافق کو
نبیؐ نے چن چن کر ختم کر دیا تھا۔ جنگِ جمل اور جنگِ صفین
اور قتل حضرت عثمان محض من گھڑت افسانے ہیں۔ علی
مرتضیٰؑ کے انتہائی مخالف حاکم شام کی شان میں اَشِدَّاءُ
علی الکفار رحماء بینھم آیا ہے۔ وغیرہ ذالک۔

مخاطب محترم نے تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر کے صفحہ ۱۰
پر فرقہ سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث کا
ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

مخاطبِ محترم کے نزدیک سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث مشرک ہیں

"حالانکہ قرآن نے فرقہ بندی کو شرک قرار
دیا ہے۔"

جواباً استفسار ہے: کہ آپ کے نزدیک
سب مشرک ہیں لیکن آپ خود ایک نیا فرقہ تصنیف فرما
رہے ہیں اسکی بنا پر آپ خود بھی مشرک ہوئے کہ نہیں؟

مخاطب محترم "تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر" کے صفحہ ۷ پر
لکھتے ہیں:۔

"محترم مودودی صاحب کی اس کتاب کی
تعریف اس لیے کی گئی ہے کہ اس میں صحابہ
پر بے بنیاد بہتانات کی توثیق ہے بصورت
دیگر بین الملکی شہرت رکھنے والے جید
عالم کی ان تصانیف پر بھی "پیام عمل" کو
صاد کرنا چاہیے جن میں اصحاب ثلاثہ کو
برحق خلیفے تسلیم کیا گیا ہے۔"

یہ فیصلہ کرنا تو آپ کے ذمہ ہے کہ صحابہ صرف

مخلصین کی جماعت کا نام ہے یا لفظ صحابہ میں ہر رطب و
یابس اور ہر کس و ناکس شامل ہے۔ اگر صحابہ صرف مخلصین کا
نام ہے تو قرآن اور مسلّمہ تاریخ کے عائد کردہ الزامات
مخلصین پر نہیں ہیں بلکہ نام نہاد مسلمانوں پر ہیں۔ وہ
الزامات بہتانات نہیں، قرآن کی طرف بہتان کی نسبت
بہتانِ اعظم ہے۔ اور اگر صحابہ میں ہر رطب و یابس اور ہر کس و
ناکس شامل ہے تو قرآنی اور تاریخی الزامات کی شکایت
کیسی؟ صحابہ پر بے بنیاد بہتانات لگانے کی اگر محترم
مودودی صاحب سے آپ کو شکایت ہے تو کسی ایسے
مسلمان مورّخ کا نام بتائیے جس نے وہ بے بنیاد بہتانات
نہ لگائے ہوں۔ اگر ایسا کوئی مسلمان مورّخ آپ کو نہیں ملتا تو
شکایت کے لیے محترم مودودی صاحب کی تخصیص کیسی؟
آپ کے لیے تو سب ہی مودودی صاحب ہوئے۔ رہا
اصحابِ ثلاثہ کا خلیفۂ برحق ہونا۔ یہ تاریخ نہیں ہے عقیدہ
ہے۔ عقیدہ کے لیے مودودی صاحب تو کیا کوئی بھی کسی پر

جبر و اکراہ نہیں کر سکتا۔

مخاطب محترم تحفظ ناموس صحابہ نمبر کے صٹ پر
حاشیہ نمبر ۲ پر فرماتے ہیں:-

"تاریخ کے بتائے ہوئے کسی واقعہ کو مسلّمہ
کہنا محض دھوکہ کی ٹٹی ہے۔ ورنہ کیا پیامِ عمل
بتا سکتا ہے کہ اصحابِ ثلاثہ کو جائز و صحیح
خلیفہ یا غاصبین بتانے میں تاریخ کا کونسا
پہلو مسلّمہ ہے؟"

جناب والا۔ تاریخ کا بتایا ہوا ہر وہ واقعہ عین
حقیقت ہے جو بلا اختلاف ہو اور سب نے اس واقعہ کو
تسلیم کیا ہو۔ البتہ اختلافی صورت میں تحقیق ضروری ہوگی۔
اصحابِ ثلاثہ کی خلافت کا جواز اور عدم جواز اس سے
تاریخ کا کیا تعلق ہے؟ تاریخ تو صرف واقعات بیان
کرتی ہے۔ جہاں تک اصحابِ ثلاثہ کی خلافت کا تاریخ سے
تعلق ہے وہ شیعہ سنی سب کے لیے مسلّمہ ہے۔ کسی کو بھی

اختلاف نہیں۔ اصحابِ ثلاثہ تو اصحابِ ثلاثہ انکار تو یزید کی
تاریخی خلافت سے بھی نہیں ہو سکتا۔

کتابچہ "صحابیت کا قرآنی تصور" کے پیش لفظ پہ مخاطبِ محترم کا ایک اور اعتراض

کتابچہ مذکورہ کے پیش لفظ میں جناب خواجہ صاحب نے مخاطبِ موصوف اور ان کے ہم نوا حضرات کے بارہ میں لکھا تھا۔ "فرماتے ہیں کہ قرآن میں بعض صحابہ کی چونکہ فلاں آیت میں تعریف آئی ہے اس لیے تمام صحابہ بے گناہ ہیں۔"

خواجہ صاحب کی مذکورہ عبارت پر مخاطبِ محترم فرماتے ہیں:۔

"صحابہ کے ساتھ بعض کا لفظ خود بڑھا لیا گیا ہے لہٰذا 'پیامِ عمل' کا اخلاقی فرض ہے کہ یا تو ہمارے مضمون میں یہ لفظ دکھائے اور

یا اپنے لفظ واپس لے۔"

(تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ۳ حاشیہ ص۵)

واقعاً جو شخص اصل سوال کا جواب نہ دے سکے وہ ادھر اُدھر ہی کی باتوں سے زور شور دکھائے گا۔ خواجہ صاحب نے آپ کی کوئی عبارت تو نقل نہیں کی تھی جو یہ کہنا صحیح ہو سکے کہ بعض کا لفظ خود بڑھا لیا گیا ہے۔ کیا لفظ "بعض" کے علاوہ بقیہ ساری عبارت آپ کی ہے؟ خواجہ صاحب نے تو اپنے الفاظ میں آپ کے عقیدہ کی ترجمانی کی ہے۔ بعض کا لفظ انھوں نے واقعیت کی بنا پر لکھا ہے کیونکہ حقیقتاً عہدِ نبیؐ کے مسلمانوں میں سے بعض مخلص حضرات کی قرآن نے تعریف و مدح کی ہے لیکن آپ نے وہ مدح و ثنا کل کی سمجھ لی۔ اسی طرح ہمارے کتابچہ کے پیش لفظ میں خواجہ صاحب نے یہ دکھا کر کہ ایک طرف تو یہ لوگ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے ساتھ سہو و نسیان، ناقص اجتہاد اور خطا کاری کی نسبت دینے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اس کے بعد یہ کہا تھا

کہ اور دوسری طرف جائز الخطاء لوگوں کو عصمت کا درجہ دینے پر اصرار کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی اس عبارت پر بھی فاضل مخاطب نے ص۳ حاشیہ نمبر ۲ پر لکھا ہے "صحابہ کو ہم نے کبھی بھی منزہ عن الخطاء اور معصوم نہیں لکھا۔" یا تو معاصر عزیز ہمارے الفاظ دکھائیے یا اپنے لفظ واپس لے"

صاحب تحفظ ناموس صحابہ" بھی عجیب باتیں کرتے ہیں خواجہ صاحب نے یہ کب لکھا تھا کہ آپ نے صحابہ کو منزہ عن الخطاء اور معصوم کہا ہے۔ آپ صحابہ کو کیا منزہ عن الخطاء اور معصوم کہتے آپ کے نزدیک تو سید انبیاء تک منزہ عن الخطاء نہیں اور جو منزہ عن الخطاء نہیں وہ معصوم کیا رہا۔ جب آپ کے نزدیک انبیاء معصومین بھی سہو ونسیان، ناقص اجتہاد اور خطاکاری سے منزہ نہیں اور صحابہ بھی امور مذکورہ سے منزہ نہیں تو آپ کی نظر میں تو جیسے وہ ویسے ہی یہ تو پھر آپ نے جائز الخطاء لوگوں کو عصمت کا درجہ دے دیا یا نہیں؟ لطف یہ ہے کہ

انبیاء کو منزہ عن الخطاء نہ مان کر آپ جو خطا کر رہے ہیں وہ تو ہے اپنی جگہ دوسری خطا آپ کی یہ ہے کہ آپ اپنا یہ عقیدہ "پیام عمل" پر بھی تھوپ رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ" اور انبیاء کی خطاؤں کا تو "پیام عمل" خود قائل ہے۔" یہ ہے پیام عمل پر بہتانِ محض۔ یا تو معاصر عزیز کسی "پیام عمل" سے انبیاء کے لیے لفظ خطا دکھاتے یا اس بہتان سے تائب ہو۔ "پیام عمل ہر نبی کو منزہ عن الخطا اور معصوم سمجھتا اور مانتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خلافت اور نبی کی جانشینی کے لیے بھی عصمت و طہارت کو شرط اول سمجھتا ہے۔ شیعہ تو نبی بلکہ امام کے لیے اجتہاد کے مفہوم کو بھی روا نہیں سمجھتا کیونکہ نبی اور امام تعلیم الٰہی خود کمالِ علم و یقین کا حامل ہوتا ہے۔ اس پر منشاء الٰہی خود بخود منکشف ہے۔ اس کے لیے امر حق کی جستجو اور تلاش کا کوئی سوال نہیں ہے۔ ان کے لیے اگر کہیں بھی لفظ اجتہاد آیا بھی ہے تو اس سے مراد دلائل کی تلاش نہیں ہے بلکہ

دلائل کا بیان فرماتا ہے۔

"پیامِ عمل" پر ایک اور اعتراض بیجا

فرماتے ہیں:-

"پیامِ عمل" بھی منکرِ حدیث ہے کیونکہ صحاح ستہ کو نہیں مانتا۔" (تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ۵ حاشیہ ص ۹)

یہ بھی ہم پر بہتانِ محض ہے۔ ہم ہر حدیث کو صدق دل سے مانتے ہیں جو صحیح اور مطابقِ قرآن ہو۔ وہ صحاح ستہ کی ہوں یا اپنی کتب اربعہ کی۔ ہم کو صحاح ستہ سے کوئی بھی دشمنی اور تعصب نہیں کہ ان میں مندرج ہونے کی وجہ سے احادیثِ صحاح سے بھی انکار کر دیں۔

حیاتِ شہداء

بلاغ القرآن اگست ۶۷ء میں ہمارے مخاطب نے صراحتِ قرآنی کی صریح مخالفت کر کے شہداء کی زندگی

سے انکار کیا تھا۔ اور یہ سمجھانا چاہا تھا کہ ان کو مردہ کہنے سے قرآن نے صرف ان کے احترام کے لیے روکا ہے۔ ہم نے اس کی تردید کرتے ہوئے "صحابیت کا قرآنی تصور" میں کہا تھا کہ اگر صرف مردہ کہنے سے روکا گیا ہوتا تب تو کسی حد تک یہ واہمہ پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ بندش ان کے احترام کے لیے ہے لیکن اس کے ساتھ یہ فرمانا کہ مردہ سمجھو بھی نہیں بالکل واضح کر رہا ہے کہ یہ محض احترام نہیں کیونکہ بعض باتیں احتراماً یا اخلاقاً کہنے کی نہیں ہوتیں لیکن واقعیت سمجھی ضرور جاتی ہے۔ کسی بات کا نہ کہنا تو انسان کے بس میں ہے مگر واقعہ کو واقعہ نہ سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں اور انسان تو انسان یہ بات تو بندہ ہو یا خدا کسی کے بھی بس کی بات نہیں۔ شہداء کو مردہ سمجھ کر مخاطب خود اپنی بے بسی دکھا رہے ہیں تو کیا خدا ایسا ظالم ہے کہ جو بات کسی کے بس کی نہیں یہاں تک کہ خود اس کے بھی بس کی نہیں اس کا حکم وہ اپنے بندوں کو دے کر تکلیف مالا یطاق

کا فاعل بنے۔ اور زبردستی اپنے بندوں کو نافرمان قرار
دے۔ اگر آپ شہید کو مردہ نہ بھی کہیں لیکن سمجھیں کہ وہ
مردہ ہے جیسے کہ آپ خود بھی مردہ سمجھ رہے ہیں تو یہ بھی
تو اللہ کے حکم کی نافرمانی ہے کیونکہ جہاں وہ یہ کہہ رہا ہے
کہ شہداء کو مردہ نہ کہو وہاں وہ بھی کہہ رہا ہے کہ ان کو مردہ
سمجھو بھی نہیں۔ ہماری اس مستحکم اور واضح استدلال کا "تحفظ
ناموس صحابہ نمبر" دیکھ جائیے کوئی جواب ہی نہیں اور نہ ہو سکتا ہے

ہمارے مخاطب محترم نے فرمایا تھا کہ "احیاء" کا معنیٰ
یہ ہیں کہ شہداء مردہ قوموں کو زندہ کرنے والے ہیں اس پر
ہم نے کہا تھا کہ "احیاء" جمع ہے حیّ کی، اور حیّ کے معنیٰ
ہیں زندہ "نہ کہ زندہ کرنے والا۔ اگر حیّ کے معنیٰ زندہ کرنے
والے کے ہو سکتے ہیں تو میّت کے معنیٰ مردہ کرنے والے
کے کیوں نہیں ہو سکتے۔ اور ہو سکتے ہیں تو خدا کو میّت کیوں
نہ کہا جائے جبکہ وہ لاکھوں زندوں کو مردہ کرنے والا ہے
ان زندوں کو جو حقیقتاً زندہ ہیں اور مردہ کرنا بھی ان کا

حقیقی معنوں میں ہے جبکہ آپ کی کہی ہوئی مردہ تو ہیں
حقیقتاً مردہ نہیں مجازاً مردہ ہیں اور ان کا زندہ کرنا بھی
حقیقتاً زندہ کرنا نہیں۔ یہ بھی مجاز ہے
تو پھر لفظ میّت۔ اللہ کے لیے جو حقیقی زندوں کو حقیقی مردہ
کرنے والا ہے کیوں نہ کہا جائے لیکن ہمارے مخاطب موصوف
بجائے اس امر کے تسلیم کرنے کے کہ ہاں اللہ کو بدرجۂ اولیٰ
میّت کہہ سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں یہ کہ "حیّ" لایموت کو کیوں
بھول گئے۔ میری سمجھ میں تو خاک بھی نہ آیا کہ یہ کیا بات کہی
گئی۔ "حیّ" لایموت کا بھولنا تو اس وقت کہا جا سکتا تھا
جب کہ ہم اللہ کو میّت بمعنیٰ مردہ کہہ رہے ہوتے۔ ہم
تو مخاطب محترم کی منطق کی رو سے صرف ان سے یہ پوچھ
رہے ہیں کہ جب حیّ کے معنیٰ مجاز در مجاز در مجاز یہ ہیں کہ
شہید مردہ قوموں کو زندہ کرنے والے ہیں تو اسی طرح آپ
کیا اسکی اجازت دیتے ہیں کہ ہم آپ کا کہنا مان کر اللہ کو
بھی زندوں کو مردہ کرنے والے معنیٰ لے کر میّت کہہ سکتے ہیں

یہاں لفظ مردہ اور لفظ زندہ دونوں لفظ مجازی نہیں حقیقی معنیٰ میں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیا ہمارے مخاطب محترم کی نظر میں قرآنِ کریم کی کوئی آیت ہے جس میں لفظ حیّ کو مردہ قوموں کو زندہ کرنے والے کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہو یا کوئی بھی صفت مشبّہ ایسے معنیٰ میں آیا ہے جیسے حُبلیٰ جسکے معنیٰ ہیں حاملہ عورت کے اور عطشان جس کے معنیٰ ہیں پیاسے کے تو کیا حبلیٰ حاملہ کرنے والی عورت کے لیے بھی آسکتا ہے؟ اور کیا عطشان اس شخص کو بھی کہہ سکتے ہیں جو دوسروں کو پیاسا کر رہا ہو۔ ہماری اس حقیقت بیانی کو ہمارے مخاطب نے محض حقارت اور استہزاء کا لہجہ فرما کر ٹال دیا کیونکہ جواب کچھ بھی نہ بن پڑا۔ ہم پھر ایک بار کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے شہداء کے لیے ایک جگہ فرمایا ہے۔ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ "شہداء کی راہ میں قتل کیے جانے والوں کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ

زندہ ہیں مگر تم شعور نہیں رکھتے"۔ یعنی تم اس حیات کو سمجھ نہیں سکتے لیکن آپ باربار یہی فرماتے جاتے ہیں کہ "شہید کا سر الگ کٹا پڑا ہے اور جسم الگ بے حس و حرکت موجود ہے۔ خود کفن پہنا کر دفن کرتے ہیں لیکن متوفیٰ مانتے نہیں یعنی کیا زندہ کو دفن کر دیا جاتا ہے"۔

جناب والا یہ آپ نے کیسے فرمایا کہ ہم متوفیٰ نہیں مانتے قرآن کریم نے شہداء کو متوفیٰ ماننے سے نہیں روکا۔ روکا ہے ہمکو انکو مردہ کہنے اور مردہ سمجھنے سے اس لیے ہم انکو مردہ نہیں مانتے۔ اب رہا انکے سر کا الگ ہو جانا اور جسم کا الگ بے حس و حرکت پڑا اور انکا دفن ہونا بیشک یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان چیزوں کی موجودگی میں یہ بات کہ وہ زندہ ہیں انکو ہم نہیں سمجھ سکتے یہی ہماری لاشعوری تو ہے جسکی قرآن کریم خبر دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ان حالات میں تم ان کا زندہ ہونا سمجھ نہیں سکتے لیکن وہ ہیں زندہ۔ اب آپ ہیں کہ ان کے مردہ ہونے کی وہی دلیل پیش کیے جا رہے ہیں جس کی قرآن پہلے ہی رد کر چکا ہے۔ اب یہ بھی بتایئے کہ جب آپ نے ان کے جسم و سر کٹ جانے پر بے حس و حرکت ہو جانے دفن ہو جانے

سے ان کو مردہ سمجھ لیا اور ساتھ ہی یہ بھی آپ نے سمجھ لیا کہ
ان کو زندہ قرآن کریم نے اس معنیٰ میں کہا ہے کہ وہ مردہ قوموں
کو زندہ کرنے والے ہیں تو یہ سب باتیں تو آپ سمجھ گئے۔ اس
کے علاوہ اب کون سی بات رہی جس کو آپ نہیں سمجھے اور جب
آپ تک اس کو سمجھ گئے تو صحابۂ کرام بھی یہ سب کچھ سمجھ گئے
ہوں گے کیونکہ آپ ان سے زیادہ تو بافہم نہیں ہو سکتے کیونکہ
آپ اپنے ہی قول سے صحابہ کی خاکِ پا کے بھی برابر نہیں لہٰذا
جو بات آپ سمجھے وہی بات نزولِ آیت پر صحابہ بھی سمجھے
تو پھر آیت میں جو "لاتشعرون" ہے یعنی تم شعور نہیں رکھتے
تم سمجھ نہیں سکتے" یہ قرآنی خبر تو غلط ہو گئی کیونکہ لاتقولوا
اور لاتشعرون کا خطاب کفار سے تو ہو ہی نہیں سکتا
مسلمانوں ہی سے ہے اور سب ہی مسلمانوں سے ہے کسی
کا استثناء تو نہیں ہے چونکہ پہلے مسلمان صحابہ ہی ہیں
لہٰذا لاتشعرون کا پہلا مخاطب بھی گروہِ صحابہ ہوا اور آپ
بھی خود مسلمان ہیں لہٰذا لاتشعرون میں آپ بھی داخل ہیں

تو پھر یہ بات کیسی ہی کہ قرآن کریم لاتشعرون کہہ رہا ہے
ان سے جو سمجھ رہے ہیں، سمجھ سکتے ہیں، سمجھ گئے ہیں تو پھر
لاتشعرون کہنے والا ہی خود نا سمجھ ہوا کہ لوگ تو سمجھ رہے ہیں
اور وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ لوگ نہیں سمجھتے۔ اب ہم آپ کی بات
کو صحیح سمجھیں کہ آپ بھی سمجھ گئے اور صحابہ بھی سمجھ گئے یا
قرآن کی بات مانیں کہ تم لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ فرمایئے
کہ آپ اپنا یہ سبز باغ دکھا کر قرآن کے باغی تو نہیں
ہو رہے ہیں؟

ہمارے مخاطب محترم نے فرمایا تھا کہ شہداء کو صرف احتراماً
مردہ کہنے سے روکا ہے اور ان کو زندہ اس لیے نہیں کہا کہ وہ
زندہ ہیں بلکہ اس لیے کہا ہے کہ وہ مردہ قوموں کو زندہ کرنے
والے ہیں۔" ہم نے اپنے کتابچہ میں ان سے سوال کیا تھا کہ قرآن
نے انبیاء کو مردہ کہنے سے احتراماً کیوں نہیں روکا۔ کیا شہداء
کا احترام انبیاء سے بھی زیادہ ہے اور انبیاء کو اس معنیٰ
سے کیوں زندہ (احیاء) نہیں کہا۔ وہ مردہ قوموں کو زندہ

کرنے والے ہیں؟ کیا شہداء، مردہ قوموں کو زندہ کرنے میں انبیاء، خدا سے بھی بڑھ کر ہیں؟ لیکن جواب قطعاً نفی میں ہے۔

قرآن کریم میں ذبیحہ کو مردہ کہنے سے کہیں نہیں روکا گیا

مخاطب فرماتے ہیں:-

"ذبیحہ کو بھی مردہ کہنے سے روک دیا گیا ہے۔"

مخاطب محترم نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں چار آیات قرآنی کی پیش کش کی ہے۔ مخاطب محترم کی پیش کردہ آیات کو ہم نے بار بار شمار کیا لیکن وہ صرف تین نکلیں چوتھی آیت نظر نہ آئی۔ وہ تین آیات یہ ہیں:-

۱۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةَ

۲۔ حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ

۳۔ اِلَّا اَن یَکُوْنَ مَیْتَةً

ان آیات سے ہمارے مخاطب موصوف یہ

ثابت کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں کہ ذبیحہ کو قرآن کریم نے چونکہ مردہ نہیں کہا اس سے ثابت ہوتا کہ اس کو اشارۃً زندہ کہا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔" اسی طرح اِنَّمَا حَرَّمَ علیکم المیتۃ میں صاف بتایا گیا ہے۔ کہ طبعی موت مرنے والا بکرا مردہ ہے۔ نیز طبعی موت مرنے والے بکرے کو حُرِّمَتْ علیکم المیتۃ اور الا ان یکون میتۃً میں بھی مردہ کہا گیا ہے جس سے عیاں ہے کہ اللہ کے نام پر ذبح ہونے والے بکرے کو زندہ کہا گیا ہے۔" ہمارے مخاطب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نام پر ذبح ہونے والے بکرے کو زندہ بتایا گیا ہے کس دلیل سے؟ اس دلیل سے کہ اسکو میتۃ یعنی مردہ نہیں کہا گیا تو مخاطب کے نزدیک بات یہ بنی کہ مردہ ہوا وہ جسکو قرآن نے میتۃ کہا اور زندہ ہوا وہ جس کو میتۃ نہیں کہا۔ یہ ہے ہمارے مخاطب محترم کی تمام و کمال منطق لیکن میں تمام حفاظِ قرآن، قراءِ قرآن اور عربی سے کچھ بھی شغف رکھنے والوں میں سے ہر انسان سے

التماس کرتا ہوں کہ وہ ہمارے مخاطبِ فاضل کی دیانتداری اور سمجھ پر ان کو داد دیں کیونکہ وہ مذکورہ ہر سہ آیاتِ قرآن سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ چونکہ قرآنِ کریم نے اللہ کے نام پر ذبح ہونے والے بکرے کو میتۃ نہیں کہا لہٰذا ذبح ہونے والا بکرا از روئے قرآن زندہ ہے اور اس کو زندہ کہا ہے اعتراماً۔ بے شک قرآن نے اگر صرف بنامِ خدا ذبح ہونے والے کو میتۃ نہ کہا ہوتا تو ہمارے مخاطب کی تقریر کچھ کارآمد ہو سکتی تھی لیکن آیاتِ مذکورۂ قرآنیہ نے لحم خنزیر اور بہائے ہوئے خون اور غیر اللہ کے نام پر ذبح ہونے والے جانوروں اور خون کے نام پر ذبح ہونیوالے جانوروں اور درندوں کے کھائے ہوئے جانوروں اور گلا گھونٹ کر یا اوپر سے نیچے گرا کر یا لاٹھی پتھر وغیرہ سے مارے ہوئے جانوروں کو بھی میتۃ نہیں کہا تو مخاطب فاضل کی منطق سے از روئے قرآن یہ سب بھی احتراماً زندہ ہیں۔ مخاطبِ محترم نے اس حقیقت کو پردہ میں رکھنے اور اپنے پیدا کیے ہوئے عیب کو چھپانے کے لیے تینوں آیتوں کو لفظ میتۃ پر ہی ختم فرما دیا اور میتۃ کے بعد کا کوئی لفظ نہ لکھا تاکہ ہم کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ قرآن

نے تو خنزیر وغیرہ کو بھی میتۃ نہیں کہا ہے لیکن ہمارا علم و فہم مخاطب عالی کی اس ندی کا محتاج نہیں ہے ہم ناظرین کے لطف اندوز ہونے کے لیے ہر سہ آیات آخری حد تک نقل کرتے ہیں۔

۱۔ انما حرم علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل بہ لغیر اللہ (البقرہ رکوع ۲۱) سوائے اسکے نہیں کہ اللہ نے حرام کیا ہے تم پر مردہ کو اور لحم خنزیر کو اور اسکو جو اللہ کے سوا اور کسی کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔

۲۔ حُرِّمَتْ علیکم المیتۃُ والدمُ ولحمُ الخنزیر وما اھلّ لغیر اللہ بہ والمنخنقۃُ والمتردیۃُ والنطیحۃُ وما اکل السبعُ الا ما ذکیتم وما ذُبِحَ عَلَى النُّصُب وان تستقسموا بالازلام ذالکم فسق۔

"حرام کیا گیا تم پر مُردہ اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور گلا

گھونٹ کر مارا جانے والا اور مار پیٹ کر کے مارا
جانے والا اور گر کر مارا جانے والا اور وہ جس کو
درندہ نے کھایا ہو، سوائے اس صورت کے کہ
تم نے اس کو ذبح کر لیا ہو اور وہ جانور جو پرستش
کے لیے نصب کی ہوئی چیزوں پر بھینٹ چڑھانے
کے لیے ذبح کیا گیا ہو اور وہ جو تیروں کے ذریعے
سے تقسیم کرو، یہ سب پلیدگی اور گندگی ہے۔"

۱۴۔ قل لا اجد فی ما اوحی الی محرما
علی طاعم یطعمه الا ان یکون میتة
او دما مسفوحا او لحم خنزیر فانه
رجس او فسقا اهل لغیر الله به۔"

"اے رسولؐ کہہ دو کہ میں جو وحی مجھ پر کی گئی ہے
اس میں کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام کی ہوئی
نہیں پاتا مگر یہ کہ وہ مردہ ہو یا بہایا ہوا خون ہو
یا خنزیر کا گوشت ہو، پس یقیناً وہ پلیدگی ہے

یا جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔"

ان ہر سہ آیات میں میتۃ کو الگ حرام کہا گیا ہے۔
خون کو الگ حرام کہا گیا ہے، خنزیر کو الگ حرام کہا گیا ہے
غیر اللہ کے ذبح کیے جانے والوں کو درندوں کے کھائے ہوئے
کو غرضکہ ہر ایک کے حرام ہونے کے لیے الگ لفظ سے
ذکر کیا گیا ہے۔ تینوں آیتوں میں میتۃ صرف خود سے مرنے
والے کو کہا گیا ہے۔ مارے جانے والے جانور کو میتۃ نہیں
کہا گیا ہے وہ خنزیر ہو یا بتوں کی بھینٹ کے لیے ذبح
کیا ہوا ہو یا کسی اور طرح پر مارا ہوا جانور ہو۔ یہ اس لیے
کہ اہلِ زبان عرب خود بخود مرنے والے جانوروں کو میتۃ
کہتے تھے اور جان کر مارے جانے والے جانوروں کو میتۃ نہ
کہتے تھے۔ چنانچہ قرآن عربی نے بھی مارے جانے والے
جانوروں کو میتۃ نہ کہا، یہ بندش نہ کسی اعزاز کے لیے
ہے نہ کسی احترام کے لیے ہے نہ صرف رائج زبان کی مطابقت
ہے ورنہ خداوند عالم کیوں خنزیر اور بتوں کے چڑھاوے

وغیرہ کا احترام کرتا۔ اب میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا خدا تعالیٰ نے شہداء کو بھی اسی طرح احتراماً مردہ نہیں کہا جس طرح اس نے کاٹے ہوئے خنزیر کو مردہ نہیں کہا۔ پہلے تو آپ نے شہداء اور ذبح شرعی والے بکروں کو برابر کر دیا تھا اب آپ نے آیاتِ قرآنی کی دلیل سے شہید اور خنزیر دونوں کو برابر کر دیا کہ جس طرح قرآن کریم نے خنزیر کو مردہ نہیں کہا اسی طرح شہید کو بھی مردہ نہیں کہا۔

قرآنِ کریم نے شہداء کو حقیقتاً زندہ کہا ہے مجازاً زندہ نہیں کہا

بلاغ القرآن اگست ۶۷ء میں ہمارے مخاطب نے فرمایا تھا کہ شہداء کو احتراماً زندہ کہا گیا ہے، ورنہ قیامت تک ان کے زندہ ہونے کا تصور تک نہیں ہو سکتا۔ اب تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر میں لفظ احتراماً کے ساتھ لفظ مجازاً کا اور اضافہ ہے۔ یعنی شہداء حقیقتاً تو ہیں مردہ، ان کو

قرآنِ کریم نے صرف احتراماً اور مجازاً زندہ کہا ہے۔ میں قرآن مجید کی دونوں آیات جو شہداء کے بارہ میں ہیں انکو مع ترجمہ پیش کر کے نظریۂ مخاطب کی تنقید کرتا ہوں۔

۱۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ۝

(سورۃ بقرۃ رکوع ۱۹)

"اور تم لوگ خدا کی راہ میں قتل کیے جانے والوں کو مت کہو کہ وہ مردہ ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے۔"

۲۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۝ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِنَ

اللہ وفضلٍ وّ انّ اللہ لا یضیع اجر
المحسنین ○ (آلِ عمران رکوع ١٨)

"تم خدا کی راہ میں مارے جانے والوں کو ہرگز
مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے
نزدیک، ان کو رزق دیا جاتا ہے۔ اس حالت
میں کہ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دیا ہے
اس سے فرحناک اور شادماں ہیں اور وہ ان
حضرات کے بارہ میں خوش خبری پاتے ہیں جو ابھی
ان کے پیچھے ہیں اور ان شہدائے سے ابھی ہرگز
نہیں ملے ہیں۔ اس امر کی کہ ان پر بھی کوئی خوف
نہیں ہے اور وہ بھی محزون نہ ہوں گے یہ لوگ
اللہ کی جانب سے آئندہ نعمت اور مہربانی کی
بشارت پاتے ہیں اور اس بات کی بھی خوشخبری
پاتے ہیں کہ اللہ محسنین یعنی نیک بندوں کے اجر کا
ضائع کرنے والا نہیں ہے۔"

ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھ کر کوئی بھی مسلمان
یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ زندگی صرف ایک لفظی زندگی ہے
جس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ اللہ کا یہ فرمانا کہ تم شہدا
کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔ یہ بھی مجازی جملہ ہے ان کو
اموات مت کہو۔ یہ بھی مجاز ہے۔ ان کو اموات مت
سمجھو یہ بھی مجاز ہے۔ وہ زندہ ہیں، یہ بھی مجاز ہے
ان کو قیامت سے پہلے رزق دیا جاتا ہے۔ یہ بھی غلط
ہے۔ وہ شہید ہونے کے بعد اپنے برادرانِ ایمانی
جو ابھی دنیا میں ان کے پیچھے ہیں اور ابھی وہ شہداء سے ہرگز
نہیں ملے ان کی بابت ان کے نیک انجام ہونے کی بشارت
پاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی چیز نہیں۔ پھر شہادت کے بعد جو خوشخبری
ان کو نعیم جنت کے بارہ میں دی جا رہی ہے اور ان سے جو
وعدہ کیا جا رہا ہے کہ تم مطمئن رہو۔ اللہ تم جیسے نیک بندوں
کے اجر کو ضائع نہ کرے گا، یہ سب لایعنی۔ کیونکہ وہ تو
شہید ہو کر بالکل مردہ ہیں۔ مردہ بھی اسلیے کہ ان کی روح

تک ناپید ہو چکی۔

١۔ آیت نمبر ٢ میں شہداء کے بارے میں ہدایت ہے کہ ان کو مردہ کہنا تو کیا مردہ سمجھو بھی نہیں

٢۔ وہ زندہ ہیں۔

٣۔ ان کو رزق دیا جاتا ہے۔

٤۔ جو نعمت خدا ان کو دے چکا ہے اس سے وہ خوش ہیں۔

٥۔ شہداء کو خوش خبری دی جاتی ہے کہ تمہارے برادران ایمانی جو ابھی تمہارے پیچھے ہیں اور تم سے آکر ابھی ملے نہیں ہیں ان کا انجام بھی بخیر ہے۔

٦۔ ان کو آیندہ کے لیے بھی بشارت دی جاتی ہے کہ اللہ کی نعمت اور مہربانی تم کو حاصل ہوگی۔

٧۔ شہداء سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ اللہ ان کے اجر کو ضائع نہ کرے گا۔

کیا یہ تمام چیزیں صاف نہیں بتا رہی ہیں کہ

شہداء بعد شہادت قیامت سے پہلے زندہ ہیں اور یہ رزق اور یہ فرحت اور دنیا میں باقی ماندہ مومنین کے بارہ میں ان کو خوشخبری کا دیا جانا اور آیندہ بھی ان شہداء کو نعیم خلد کے ملنے کی بشارت اور نعیم جنت سے ان کا اجر قرار پانے کا وعدۂ الٰہی یہ سب کچھ شہداء کی اسی ہی زندگی کے واقعات ہیں جو شہادت کے بعد اور قیامت سے پہلے کے موجود کی ہے۔

آیت میں خصوصیت سے دو چیزیں مقابلہ کی ہیں۔

فرحین بما آتاھم اللہ من فضلہ "وہ خوش ہیں اللہ کی اس نعمت سے جو اللہ ان کو دے چکا ہے۔ یہاں عطاء نعمت کے لیے ماضی کا صیغہ ہے آتاھم اس کے بعد یستبشرون بنعمۃ من اللہ ہے جس میں آیندہ نعمت کی بشارت ہے۔ یہاں سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس پائی ہوئی نعمت سے وہ خوش ہیں یہ نعمت اس عالم برزخ کی ہے جو بعد شہادت اور قبل قیامت ان کو ملی ہے اور جس نعمت کی بشارت اور آیندہ کے لیے یہ

وعدہ ہے کہ ان کے اجر کو اللہ ضائع نہ کرے گا۔ یہ ذکر روزِ
جزا اور قیامت کا ہے۔

جب کوئی لفظ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے تو وہاں حقیقت کے کہنے اور سمجھنے سے روکا نہیں جاتا

اگر کوئی متکلم کسی لفظ کو مجازی معنیٰ میں استعمال کرتا
ہے تو وہ خود یہ چاہتا ہے کہ سننے والا اس کو مجاز ہی سمجھے
حقیقت نہ سمجھ بیٹھے اس لیے بولنے والا ایسا کوئی نہ کوئی
قرینہ اپنے کلام میں رکھتا ہے جس سے سننے والے پہ
یہ ثابت ہو رہا ہو کہ یہاں لفظ کا استعمال مجازاً ہوا ہے
حقیقتاً نہیں ہوا۔ لیکن دونوں آیتوں کو اچھی طرح دیکھیے۔
کیا ان میں کوئی لفظ بھی ایسا ہے کہ جس سے ساری یہ بات انسان
مجازی سمجھی جا سکے۔ اگر شہداء کو احیاءٌ (وہ زندہ ہیں) مجازاً
کہا گیا ہوتا تو لاتشعرون کہنے کا کوئی تک نہ تھا۔ (لیکن تم شعور
نہیں رکھتے) کیونکہ مجازی زندگی کو ہر شخص سمجھ سکتا تھا جیسے

کہ ہمارے مخاطب محترم بھی اپنی دانست میں یہی سمجھ رہے ہیں
کہ میں سمجھ رہا ہوں۔ دوسرے یہ کہ جب کوئی لفظ مجازاً استعمال
کیا جاتا ہے تو وہاں حقیقت کے کہنے اور سمجھنے سے روکا
نہیں جاتا۔ اور اگر دوسرے پہلو کے کہنے اور سمجھنے سے
روک دیا جائے تو پھر وہ مجاز نہیں حقیقت ہے مثلاً اگر
کوئی شخص حکیم اجمل خاں کی طرف اشارہ کر کے کہے کہ یہ ارسطو
ہیں تو اس کے آگے کہنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کو
اجمل خاں نہ سمجھنا۔ کیونکہ کہنے والا ان کو اجمل خان سمجھ کر
مجازاً ارسطو یا بقراط کہہ رہا ہے لیکن جس وقت کہنے والے
کا اشارہ خود ارسطو ہی کی طرف ہو کسی اور کی طرف نہ
ہو اور اب وہ ارسطو کی طرف اشارہ کر کے کہے کہ یہ ارسطو
ہیں تو اس جملہ کے بعد کہنے والے کو پورا حق ہے یہ کہنے کا کہ
ان کو اجمل خاں نہ کہنا، ان کو اجمل خاں نہ سمجھنا کیونکہ بولنے
والے نے لفظ ارسطو حقیقی اور واقعی معنیٰ میں استعمال کیا
ہے۔ لہٰذا اگر خدا تعالےٰ نے شہداء کو احیاءٌ (وہ زندہ ہیں)

صرف مجازاً کہا ہوتا تو اس کے ساتھ یہ نہ فرماتا کہ ان کو مردہ نہ کہنا، ان کو مردہ نہ سمجھنا کیونکہ مجاز میں حقیقت فہمی سے روکا نہیں جاتا۔

مخالف پہلو کی نفی اسی وقت ہوتی ہے جبکہ لفظ حقیقی معنیٰ میں بولا جا رہا ہو

جن بتوں کی پرستش کی جا رہی تھی یا کی جا رہی ہے وہ حقیقی معنیٰ میں بے جان ہوتے ہیں لہٰذا قرآن مجید سورہ نمل رکوع ۲ میں ان بتوں کے لیے فرمایا گیا ہے "اموات غیر احیاء" یعنی بے روح ہیں زندہ نہیں ہیں۔ چونکہ آیت میں لفظ اموات حقیقی معنیٰ میں آیا تھا اس لیے اموات کا مخالف پہلو یعنی احیاء کی نفی کی گئی اسی طرح شہداء کو احیاء کہہ کر ان کے اموات ہونے کی نفی کر دی گئی لہٰذا شہداء کے لیے لفظ احیاء بھی اسی طرح حقیقی معنیٰ میں ہے جس طرح لفظ اموات بتوں کے

لیے حقیقی معنیٰ میں ہے۔

یرزقون سے مراد قیامت کا رزق نہیں ہو سکتا

شہداء کے لیے آیت میں ہے بل احیاء عند ربہم یرزقون "بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے نزدیک، ان کو رزق دیا جاتا ہے" ہمارے اس ترجمہ پر ہمارے مخاطب عزیز کو اعتراض ہے کہ رزق دیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ کیوں کیا گیا۔ رزق دیا جائے گا۔ کیوں نہیں کہا تاکہ ہمارے مخاطب اس وعدۂ رزق کو قیامت پر ٹال سکیں۔ برادرِ عزیز مضارع عربی میں حال اور مستقبل دونوں زمانوں کے لیے ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ زمانۂ حال پہلے ہے۔ مستقبل اس کے بعد ہے۔ یہ کوئی عقلمندی تو نہیں ہو سکتی کہ جو پہلے ہے اس کو پھلانگ کر مستقبل پر کود پڑیں۔ حال کے بغیر مستقبل آ ہی کیسے سکتا ہے؟ ہمارے مخاطب تو اس ہی ترجمہ پر معترض ہیں جو حال کی بنا پر کیا گیا

ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ حال تو حال اس کے مفہوم
میں ماضی بھی داخل ہے کیونکہ یرزقون ایک قرار داد کا ذکر
ہے اور جب بھی مستقل طور پر کوئی قرار داد بیان کی
جاتی ہے اس میں عموماً ماضی، حال مستقبل سب ہی زمانے
ہوتے ہیں وہاں صیغوں سے بحث ہی نہیں رہتی کہ ماضی
کا صیغہ ہے یا مضارع کا۔ خود اپنی زبان میں دیکھ لیجیے
مثلاً جس نے ڈھونڈھا اس نے پایا۔ جو اچھا کرتا ہے
اس کو اچھا کہا جاتا ہے۔ جو اچھا کرے گا اس کو اچھا کہا
جائے گا۔ پہلے جملہ میں ماضی ہے دوسرے میں حال ہے۔
تیسرے میں مستقبل ہے لیکن پہلا جملہ ہو یا دوسرا یا تیسرا
ہو ہر ایک جملہ ماضی، حال، مستقبل ہر زمانہ کے لیے ہے
ماضی والے جملہ کو ماضی سے تخصیص نہیں۔ حال والا جملہ
حال میں منحصر نہیں مستقبل والا جملہ مستقبل سے مخصوص
نہیں۔ یہی اسلوب قرآنی قرار داد کا ہے۔ یا ایھا الذین
آمنوا۔ اس میں آمنوا صیغۂ ماضی ہے مگر مخاطب وہ بھی

ہیں جو اس وقت ایمان لا چکے تھے اور وہ بھی ہیں جو آیت
کے بعد قیامت تک کسی وقت بھی ایمان لائیں۔ سورۂ والعصر
میں الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات کہہ کر نیک
مومنین کو بشارت دی گئی ہے۔ صیغے ماضی کے ہیں لیکن
بشارت ان کو بھی ہے جو اس وقت تک ایمان لا کر نیک
ہو چکے تھے اور ان کو بھی ہے جو آیت کے بعد قیامت
تک کسی زمانہ میں بھی مومن اور نیک ہوں یا مثلاً فرمایا جاتا
ہے الذین یکنزون الذھب والفضۃ الخ جو لوگ
سونا اور چاندی کو خزینہ بنا کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں
کرتے ان کی پیشانیوں اور پشتوں کو ان سے داغا جائے گا یا
جیسے یؤذون اللہ ورسولہ الخ جو لوگ اللہ اور رسول کو
اذیت دیتے ہیں الخ صیغے مضارع کے ہیں مگر حال اور مستقبل ہی
کے لیے نہیں بلکہ ماضی، حال، مستقبل ہر زمانہ ہی کے لیے ہے۔ اسی
طرح شہداء کے لیے یرزقون کہہ کر ایک مستقل قرار داد بیان
کی جا رہی ہے۔ اب جو آیت سے پہلے شہید ہو چکے ان کو

ماضی میں بھی رزق ملا، حال میں بھی مل رہا ہے، مستقبل میں بھی ملے گا اور جو لوگ آیت کے بعد شہید ہوئے آیت نے ان کے بھی رزقِ مستقبل کی خبر دی، کیونکہ شہادت مستقبل میں ہے تو رزق بعدِ شہادت بھی مستقبل ہوگا۔

رزقِ مذکور شہداء کی شہادت کے بعد سے ہے

لہٰذا وقتِ قتل سے وقتِ رزق بہر حال مستقبل ہے

ہمارے مخاطبِ عزیز نے تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر کے ص۳۷ سے ص۳۸ تک بڑا زور و شور دکھایا ہے۔ ان کی دانست میں ان کو قرآن کی ایسی آیت مل گئی ہے جس سے وہ ثابت کر دیں گے کہ شہداء چونکہ مردہ ہیں اس لیے انکو قیامت میں رزق دیا جائے گا۔ اس سے پہلے نہ وہ خود ہیں نہ ان کی روح ہے نہ ان کو رزق دیا جاتا ہے ہمارے مخاطب نے آیت پیش کی ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْا

اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا۔

(مفہوم) اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں ہجرت کریں پھر وہ اللہ کی راہ میں مارے جائیں یا (راستہ کی تکلیفوں کی تاب نہ لاکر طبعی موت) مر جائیں اللہ ان کو احسن رزق عطا فرمائے گا (قیامت کو جب وہ اٹھائے جائیں گے۔"

ساتھ ہی مخاطب محترم نے فرمایا ہے: "مضارع پر لام تاکید اور نونِ مشددہ داخل ہو تو وہ مستقبل کے لیے مختص ہو جاتا ہے۔"

جناب والا آیت کی شانِ نزول اور آیت کا مفہوم جو آپ نے توڑ موڑ کر بیان فرمایا ہے وہ نہیں ہے۔ آپ نے "راستہ کی تکلیفوں کی تاب نہ لاکر طبعی" یہ سب لفظ اپنی طرف سے بڑھائے ہیں۔ آیت میں تو صرف ماتوا ہے لیکن ہم بحث کو کوتاہ کرنے کے لیے آپ کے تصرفاتِ بے جا سے صرفِ نظر کرتے ہیں اور آپ کی ہر بات جوں کی توں مان کر مانے لیتے ہیں کہ رزق کا وعدہ مستقبل ہی میں کیا گیا ہے۔ مگر کون سا

مستقبل؟ وہ جو قتل کے بعد کا ہے اور قیامت سے پہلے
ہے۔ رزق جبکہ بعدِ قتل ہے تو وہ رزق قتل کے وقت کا
مستقبل تو ہو گا ہی کیونکہ رزق قتل کے عین وقت پر تو نہیں
مل رہا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ایک لمحہ کے بعد دوسرا لمحہ
اس کا مستقبل ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ وعدۂ خلافت
کے لیے آپ نے جس آیت کو پیش کیا تھا وہاں بھی ہر جگہ
لام تاکید اور نون مشددہ ہے لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ، وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ۔ ہم ضرور ضرور خلیفہ بنائیں گے ان کو، اللہ
ان کے لیے ضرور ضرور تمکین دے گا ان کے دین کو اور ضرور
ضرور ان کے خوف کے بعد خوف کو امن سے بدل دیگا۔
یہاں تو آپ کے نزدیک اللہ کا یہ وعدۂ خلافت اور وعدۂ
تمکین تو اتنا جلد وفا ہو جانا چاہیے کہ دفنِ رسول کا بھی انتظار
نہ کیا جائے دو چار گھنٹہ کی بھی دیر نہ ہو مگر وہی وعدہ کرنے
والا جب شہداء کے لیے کہے لیرزقنھم تو یہاں آپ
پورا زور اس پر لگائیں کہ اللہ کا یہ وعدۂ قیامت سے اس

طرف پورا ہی نہ ہو۔ یہ تو کوئی انصاف کی بات نہ ہوئی
کہ بالکل وہی لفظ جب اپنے لیے ہو تو وہ بہتری فوراً پوری
ہو جائے اور جب دوسروں کے لیے ہو تو قیامت ہے کہ
وہ قیامت پر ٹالا جائے۔ اگر لیرزقنھم کا رزق قیامت
سے پہلے نہیں تو لیستخلفنھم میں کیسے کہ خلیفہ بھی اللہ
آخرت میں بنائے گا۔ ورنہ امام مہدیؑ تو اسی دنیا میں ہوگا اور
قیامت سے پہلے ہی ہوگا تو اللہ کے وعدۂ تمکین کو آپ امام
مہدیؑ سے متعلق کیوں نہیں سمجھتے۔ آپ کا اس پر انتہائی زور
ہے کہ لیرزقنھم میں چونکہ لام تاکید اور نون تاکید ہے اس
لیے یہ مستقبل کے لیے ہے اس سے آپ کی کونسی بات بن گئی
آپ کی بات تو اس وقت بنتی نظر آتی جب آپ یہ ثابت کرتے
کہ لام تاکید اور نونِ تاکید جب مضارع پر آتا ہے تو وہ
خبر قیامت سے پہلے پوری نہیں ہوتی لیکن اس کا ثابت کرنا
تو رہا درکنار آپ یہ کہنے کی بھی ہمت نہیں کر سکتے۔ آپ
کے اس فرمانے سے کہ یہ وعدۂ رزق مستقبل کے لیے ہے

آپ کی بحث کو کیا فائدہ پہنچا۔ مستقبل کے معنی قیامت کے
تو نہیں ہیں مستقبل تو ہر آنے والا لمحہ ہے۔ شہید کے قتل
ہونے کے بعد جو دوسرا لمحہ ہے کیا وہ مستقبل نہیں ہے؟ جب
شہید کا رزق بعدِ قتل ہے تو وہ رزق، قتل کا مستقبل نہ ہوا؟
ہمارے مخاطبِ محترم نے یہ نہ سوچا کہ جس رزق کا محض شہدا
سے بالتخصیص وعدہ کیا جا رہا ہے اگر اس رزق سے رزقِ جنت
مراد ہے تو شہداء کی تخصیص کیا رہی۔ جنت میں تو ہر جنتی کو
حسب دلخواہ رزق ملے گا۔ اگر مخاطب فرمائیں تو شہداء کو وہاں جو خاص
رزق ملے گا اس کو قرآنِ کریم نے رزقِ حسن فرمایا ہے لہٰذا وہ
اعلیٰ درجہ کا رزق ہوگا۔ تو میں یاد دلاتا ہوں کہ اللہ نے تو رزقِ
دنیا کو بھی رزقِ حسن فرمایا ہے چنانچہ سورۂ نحل رکوع دس میں
فرمایا گیا ہے۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ
عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ
يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا هَلْ يَسْتَوٗنَ ٥ اللہ
مثال بیان کرتا ہے کہ ایک تو وہ غلام ہے جو خود دوسرے

کی ملکیت ہے اس کا کسی شے پر بس نہیں اور ایک وہ ہے
جس کو ہم نے رزقِ حسن دیا ہے۔ وہ اپنے رزق میں سے
مخفی اور آشکارا جس طرح چاہے خرچ کرے کیا یہ دونوں
برابر ہیں تو جب اللہ کا دنیا میں دیا ہوا رزق بھی رزقِ حسن ہے
تو اہلِ جنت کا رزق تو کیوں نہ رزقِ حسن ہوگا جو شہید اور
غیر شہید ہر جنتی کو ملے گا۔ اس صورت میں شہید کی کوئی تخصیص
تو نہ ہوئی۔ تخصیص کی صورت تو یہی ہے کہ عام مومنین کو تو رزق
ملے گا جنت میں قیامت کے بعد لیکن شہید چونکہ زندہ ہیں
اس لیے ان کو بعد شہادت قیامت سے پہلے ہی رزق ملتا
رہے گا۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ مستقل قرارداد کو پیش کرنے
کے لیے ماضی ہو یا مضارع۔ اس کا اثر و نفوذ ہر زمانہ پر ہے
وہاں اس کی بحث کہ صیغہ ماضی کا ہے یا مضارع کا یہ بے کار
ہے خود ہمارے مخاطب نے اپنی پیش کی ہوئی آیت مذکورہ میں
وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا
کا ترجمہ ماضی قرار دے کر ہرگز نہیں کیا حالانکہ ھاجروا

قُتِلوا، ماتوا، یہ سب ماضی تھا مگر ترجمہ مضارع کا کیا ہے۔ ماضی میں ترجمہ ہوتا تو اس طرح ہوتا جن لوگوں نے ہجرت کی پھر وہ قتل کیے گئے یا مر گئے۔ مگر ترجمہ موصوف نے حالانکہ ماضی کے صیغے تھے اسی طرح نہیں کیا بلکہ ترجمہ کیا ہے یہ کہ "اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں ہجرت کریں پھر وہ اللہ کی راہ میں مارے جائیں یا مر جائیں۔" کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایک ہی آیت ہے جس کے ماضی کو آپ قرار دے رہے ہیں استمرار اور استمرار جو واقعاً استمرار ہی کی صورت میں ہے اس کو قرار قرار دے رہے ہیں غیر استمرار یعنی لیرزقنّھم نہ ماضی کے لیے ہے نہ حال کے لیے ہے۔ نہ قیامت سے پہلے کے پورے مستقبل کے لیے ہے، وہ ہے محض قیامت کے لیے، دیدار قیامت کے منتظر پہلے اس قیامت کو دیکھ لیں۔ اب ہمارے ناظرین نہایت لطف اندوز ہوں گے یہ دیکھ کر کہ فاضل مخاطب نے آیۂ مذکورہ کو (والذین ھاجروا فی سبیل اللہ ثم قتلوا او ماتوا لیرزقنھم اللہ رزقا

حسنا) بس یہاں تک نقل فرمایا ہے تاکہ ٹھونس ٹھانس کر اس رزق کو قیامت سے مخصوص کر دیں حالانکہ قرآنِ کریم میں اس کے بعد فرمایا جاتا ہے لَیُدْخِلَنَّھُم مُّدْخَلًا یَرْضَوْنَہٗ ط اللہ ضرور ضرور ان شہداء کو ایسے مسکن (جنّت) میں داخل کرے گا جس کو یہ پسند کریں گے۔ چونکہ اس عبارتِ آیت سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ جس رزق کا وعدہ شہداء سے ہو رہا ہے۔ یہ وہ رزق ہے جو ان کو جنّت میں پہنچنے سے پہلے ملتا ہے اس لیے موصوف نے اس جملہ کو پردہ میں رکھا یہ پردہ ہم کو اٹھانا پڑا۔ فرمائیے آپ ہی کی پیش کی ہوئی آیت سے دوپہر کے سورج کی طرح یہ بات کھل گئی کہ شہداء کو جنت میں داخل کرنے سے پہلے ہی سے رزق دیا جاتا ہے جس کے بعد ان کو جنّت کا مسکن جس کو وہ پسند کریں گے دیا جائے گا۔

جس آیت کو ہمارے مخاطب نے بڑے زور شور سے پیش کیا تھا اور فرمایا تھا کہ عربی کے مبتدی تک جانتے

ہیں کہ لام تاکید اور نون تاکید مضارع پر آتا ہے تو وہ مستقبل کے لیے مخصوص ہو جاتا ہے اور اس سلسلہ میں وہ ہم پر قرآن کے جاہل مطلق ہونے کی پھبتی تک کسنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اس ہی آیت نے مکمل طور پر یہ ثابت کر دیا کہ چونکہ شہداء زندہ ہیں اس لیے ان کو قتل کے بعد رزق دیا جاتا ہے اور قیامت آنے پر ان کو ان کی پسند کا مسکن (جنت میں) دیا جاتا ہے۔ اب وہ خود فیصلہ فرما لیں کہ قرآن کا جاہلِ مطلق ہمارے مخاطب ہوئے یا ہم ہوئے۔ بایں ہمہ قرآن کا جاہل ہونا ہمارے مخاطب کے لیے عیب ہو یا نہ ہو لیکن ہمارے نزدیک قرآن سے ہمارا جاہلِ مطلق ہونا ہمارے لیے کوئی عیب نہیں۔ "تاویلِ آیاتِ قرآن کا جاننا اللہ اور راسخون فی العلم کا کام ہے۔ ہمارے مخاطب ممکن ہے اپنی ذات کو اللہ یا راسخون فی العلم میں کوئی فرد سمجھتے ہوں لیکن ہم نہ اللہ ہیں نہ راسخون فی العلم میں سے ہیں۔ جو کچھ قرآن کریم میں نظر آ جاتا ہے یہ سب راسخون فی العلم

کا صدقہ ہے اور ان کے دامن سے وابستگی کا نتیجہ ہے اور راسخون فی العلم محمدؐ و آلِ محمدؐ کے سوا کوئی نہیں۔ اب میں قرآنِ مجید سے مثال پیش کر کے ثابت کرتا ہوں کہ لامِ تاکید و نونِ مشددہ ہونے کے باوجود مضارع میں ماضی، حال، مستقبل ہر ایک زمانہ ہو سکتا ہے۔

لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین آمنوا الیھود والذین اشرکوا (سورۃ المائدہ)

"اے رسولؐ تم ایمان لانے والوں سے شدید ترین عداوت رکھنے والا پاؤ گے یہود کو اور ان کو جو مشرک ہیں"۔ اب دیکھیے یہ سورۃ مدنی ہے جو بعد ہجرت نازل ہوا۔ نبیؐ ہجرت سے تیرہ برس پہلے مشرکین کی انتہائی عداوت اور انتہائی اذیت رسانی کا ہر نقشہ دیکھ چکے تھے۔ ان مشرکین کی عداوت اور اذیت رسانی ہی بالآخر حضورؐ کی ہجرت کا سبب ہوا لہٰذا نبیؐ سے یہ خطاب کہ تم مشرکین کو مومنین کا سخت دشمن پاؤ گے۔ اس حالت میں ہوا ہے جبکہ

نبیؐ ان کو اپنا اور مومنین کا سخت دشمن پا چکے تھے لہذا
لتجدن ؔ کا لام تاکید اور نون مشددہ صرف مستقبل ہی
سے مخصوص نہیں کر رہا ہے بلکہ یہ مشرکین کا وہ استمراری عمل
ہے جو ماضی، حال مستقبل ہر زمانہ میں رہا ہے اور رہے گا اور
ایسا رہے گا کہ جو پکے مشرک اور مشرکین کے سرغنہ ہیں وہ
تماشی مسلمان ہونے کے بعد بھی اپنی سرشت نہ چھوڑیں گے
اور پکے مومنین سے ان کی عداوت کسی وقت میں بھی زائل
نہ ہوگی اور اس میں کس کو شک ہو سکتا ہے کہ اہل بیتؑ نبیؐ
سے زیادہ پکے مومن اور کون ہوں گے لہذا یہ مشرک اسلام
کا چولا بدل کر بھی اہل بیتؑ رسولؐ کے شدید ترین دشمن ہی رہیں
گے۔ بجا بجا اہل بیتؑ کے خلاف صف آرائی کریں گے اور
اس بات پر تلے ہوں گے کہ اہل بیتؑ کا خاتمہ کر دیں۔ ان
کے بچہ بچہ کو قتل کر دیں۔ چنانچہ سب کچھ کر گزرے مگر دشمنی
کی آگ اس پر بھی نہ بجھی۔ اب یوں سمجھیے کہ قرآنِ کریم خبر
دے چکا ہے کہ مومنین سے عداوت تو کسی نہ کسی حد میں

ہر کافر کو ہو گی لیکن اشد الناس عداوۃ" یعنی سب سے زیادہ
شدید ترین عداوت صرف یہودی اور مشرکین کو ہے اور
رہے گی لہٰذا بہترین مومنین (اہل بیتؑ) سے جن لوگوں
نے شدید ترین عداوت کی کہ ان کے بوڑھے، جوان، بچے
ہر ایک کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا وہ کون تھے؟ از روئے قرآن
ایسی شدید عداوت یا یہود کر سکتے تھے یا مشرکین تو پھر وہ
لوگ ان ہی دو میں سے ایک ہیں اور یہ طے شدہ ہے کہ یہ
لوگ نہ اب یہودی ہیں نہ پہلے یہودی تھے تو پھر لامحالہ
مشرک ہوئے۔ پہلے بھی مشرک تھے مگر چھپے ہوئے تھے۔ اب بھی
ہیں وہی جو تھے اور ان کا وہی کردار ہے جو تھا تو پھر دل بھی
وہی ہے جو تھا اور دل میں بھی وہی ہے جو تھا۔ قرآنی
شہادت عین حق ہے کہ حقیقی اور مکمل مومنین سے انتہائی
عداوت یہود و مشرکین ہی کر سکتے ہیں ورنہ مومن تو مومن
دوسرا کافر بھی ایسی شدید عداوت نہیں کر سکتا۔ غرض کہ
مشرکین کی عداوت کو نبیؐ سالہا سال تک بچشم خود دیکھ

چکے تھے۔ اب رہی یہودیوں کی انتہائی عداوت تو یہ بھی
ظاہر ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے اگر یہودیوں کی
شدید دشمنی کے واقعات رونما نہ ہو چکے ہوتے تو خداوند عالم
یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ یہودیوں نے ابھی کوئی شدید عداوت
کی نہ تھی اور وہ قرآن کریم کے الفاظ میں اشتہار عام دے
دیئے کہ یہ یہودی اے مومنین تم سے انتہائی عداوت کریں گے۔
ایسی بات عالم الغیب رازدارانہ انداز میں تو اپنے نبیؐ سے
کہہ سکتا تھا لیکن قرآن کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں رہ سکتا
تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن اور مناسب تھا کہ یہودیوں کی عداوت
کھل جانے سے پہلے ہی خدا تعالیٰ ان کو مومنین کا شدید ترین
دشمن کہہ کر ان کو دشمنی پر اکسا دے اور جو لوگ ابھی دشمن
نہیں ہیں ان کو دشمن اور پکا دشمن کہہ کہہ کر دشمن بنا دے۔
ایک طرف مومنین کو یہودیوں کے خلاف مشتعل کر دے
دوسری طرف یہودیوں کو مومنین سے دشمنی کے لیے کھڑا
کر دے لہٰذا ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ قرآن نے یہودیوں

اور مشرکین کو مومنین کا سخت ترین دشمن اس وقت کہا
جب کہ یہ دونوں آیت کے پہلے سے شدید عداوت کھلم کھلا
کر رہے تھے۔ ہمارے مخاطب کا لام تاکید اور نون مشددہ
محض مستقبل سے مختص نہ رہا بلکہ ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں
میں استمرار عداوت ظاہر کر رہا ہے۔

قرآن کریم میں بعض زندہ لوگوں کو مُردہ کہا گیا ہے لیکن کسی مُردہ کو زندہ نہیں کہا گیا

ہمارے مخاطب "تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر" کے ص ۲۸ پر
لکھتے ہیں:۔

"قرآن کریم میں کہیں مجازی طور پر مُردوں کو
زندہ اور کہیں زندوں کو مُردہ کہا گیا ہے۔"

مخاطب محترم نے دو دعوے کیے مگر پہلا دعویٰ یعنی
"مُردوں کو زندہ کہنا" بے دلیل کیا اور بے دلیل چھوڑ دیا۔
قرآن کریم نے کہیں بھی کسی مُردہ کو زندہ نہیں کہا۔ مخاطب

محترم کے علم میں کوئی آیت تھی ایسی تو اُس کو کس دن کے
لیے چھپا کر رکھا۔ پیش کر دیتے اور اگر کوئی آیت نہ ملی تھی
اور نہ ملے گی تو قرآنِ کریم جو امّ الکتاب ہے اس پر کیوں
بہتان باندھا۔ یہ جرم تو امّ المومنین پر بہتان باندھنے
سے بھی کہیں زیادہ ہے کیونکہ یہ بہتان تو خدا تعالےٰ پر ہوا۔
اگر آپ کا مطلب ان دو آیتوں سے ہے جن میں شہدائے راہِ
خدا کو زندہ فرمایا ہے تو وہاں تو مُردوں کو زندہ نہیں کہا
بلکہ زندوں کو زندہ کہا ہے جو اظہر من الشمس ہو چکا۔ پھر
زیر بحث آیت میں اگر آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان
میں زندہ کہا گیا ہے اُن کو جو مُردہ ہیں تو اس دعوے کی
دلیل اور اس دعوے کی مثال خود یہی آیت تو نہیں ہو سکتی
اس کی مثال یا دلیل میں کوئی اور آیت پیش کرنا تھا۔ خود
دعویٰ تو دلیل نہیں ہو سکتا۔ البتہ ہم اس کو مانتے ہیں
کہ قرآنِ کریم نے بعض زندوں کو مُردہ کہا ہے کیونکہ زندگی نام
ہے۔ مختلف صلاحیتوں کا۔ اگر کوئی شخص ان میں سے کوئی

صلاحیت کھو بیٹھا تو چونکہ وہ صلاحیت ختم ہو گئی اور وہ شخص
اس صلاحیت کے اعتبار سے جزءً مردہ ہو گیا مثلاً جس کی بصارت
زائل ہو گئی وہ قوتِ بصارت کے اعتبار سے مُردہ ہو گیا۔ جس
کی سماعت زائل ہو گئی وہ قوتِ سماعت کے اعتبار سے مُردہ
ہو گیا۔ جو عقل اور قبولِ ہدایت کی صلاحیت کھو بیٹھا وہ عقل و
فہم کے اعتبار سے مُردہ ہو گیا۔ بہرحال زندہ شخص کو کسی
صلاحیت کے مفقود ہو جانے کی وجہ سے مُردہ کہا جا سکتا ہے
لیکن جو ہو ہی کلیۃً مُردہ اور معدوم اس کو کسی اعتبار سے
بھی زندہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہست کے ساتھ ہزاروں نیست کہے
جا سکتے ہیں لیکن نیست کے ساتھ ہست کہنے کا کوئی سوال ہی
نہیں مثلاً آپ انسان ہیں تو اس "ہیں" کے ساتھ ہزاروں نہیں
والے جملے کہے جا سکتے ہیں جیسے کہ آپ انسان ہیں خدا نہیں
ہیں، نبی نہیں ہیں، امام نہیں ہیں، جن نہیں ہیں، فرشتہ
نہیں ہیں، آسمان نہیں ہیں، زمین نہیں ہیں، دریا نہیں ہیں،
پہاڑ نہیں ہیں، پرندہ نہیں ہیں، درخت نہیں ہیں، حیوان

نہیں ہیں، یہاں ہیں وہاں نہیں ہیں، ایسے ہیں ویسے نہیں
ہیں، اتنے سے ہیں کتنے نہیں، اب ہیں جب نہیں ہیں ہرگز
ہزاروں نہیں آسکتے ہیں کیونکہ آپ ہیں لیکن جو ہے ہی نہیں
وہ کیا ہے؟ کون ہے؟ کیسا ہے؟ کب ہے؟ کتنا ہے؟
کہاں ہے؟ یہ سوال سب مہمل ہیں کیونکہ وہ ہے ہی نہیں
لہٰذا جو زندہ ہے وہ کسی نہ کسی اعتبار سے مردہ ہوسکتا ہے
لیکن مردہ کسی اعتبار سے بھی زندہ نہیں ہوسکتا۔ آپ
جب یہ مان چکے کہ اللہ تعالیٰ بہت سے زندہ لوگوں کو
بھی مردہ کہتا ہے تو اس ہی سے آپکو یہ درس عبرت حاصل کرنا چاہیے تھا کہ جو زندوں
کو بھی مردہ کہتا ہو وہ کسی مردہ کو زندہ کیسے کہہ دیگا۔ اسکا زندوں کو مردہ کہنا ہی
اسکی دلیل ہے کہ اسکی نظر میں معیار زندگی اتنا اونچا ہے کہ اس معیار پر
زندہ بھی زندہ نہیں قرار پاتے وہ صاحب نظر جب کسی کو زندہ
کہے گا تو وہ کیسا مکمل زندہ ہوگا۔ لیکن آپ معیار قدرت
کو اتنا گرا رہے ہیں کہ وہ زندہ کہہ رہا ہے ان کو جن میں کوئی
بھی زندگی نہیں بلکہ بالکل مردہ ہیں۔

قرآن کریم میں روح کا لفظ انسانی جان کے لیے ضرور آیا ہے اسکی نفی کرنا غلط ہے

چونکہ ہمارے معزز معاصر کے عقائد اور بیانات عموماً
بے روح ہوتے ہیں اس لیے وہ سرے سے اس روح ہی
کے منکر ہو گئے جس کی آمد و شد کا نام حیات و موت
ہے لیکن ہم جس طرح ان کے عقائد و نظریات کو بے روح
سمجھ سکتے ہیں۔ اس طرح خود ان کی ذات کو بے روح نہیں
مان سکتے کیونکہ ان کے عقائد تو ہیں خود ان کے لیکن ان
کی روح صنعت پروردگار ہے جس سے انکار ممکن نہیں
مخاطب محترم فرماتے ہیں:۔

"گزارش ہے کہ قرآن کریم پر غور کرنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ انسان ترکیب عناصر ہی سے
عبارت ہے اور ترکیب عناصر ہی سے اس میں
زندگی آجاتی ہے اور عدم ترکیب سے ختم ہو

جاتی ہے۔ روح نامی کوئی ایسی چیز ہی نہیں
جو داخل ہو کر جسم کو زندہ کر دیتی ہو اور خارج ہو
کر مُردہ۔ جیسے کہ قرآنِ کریم میں روح کا لفظ
انسانی جان کے لیے آیا ہی نہیں بلکہ یہ لفظ تعلیم
ربانی، وحیِ الٰہی کے لیے آیا ہے"

پھر لکھتے ہیں:-

"المختصر قرآنِ کریم کی رو سے روح نامی کوئی چیز
ایسی موجود نہیں جس کے ادخال و اخراج سے
جسدِ خاکی میں جان پڑتی ہو یا نکل جاتی ہو۔
قرآنِ کریم کی رو سے روح بمعنی صرف قرآنِ کریم
ہے۔" (تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص۳۳ و ۳۴)

اوّل تو ترکیبِ عناصر کا انحصار صرف انسان سے
کرنا ایک مہمل اور لایعنی چیز ہے جبکہ کائنات کے ہر جسم کے
لیے ترکیبِ عناصر موجود ہے۔ یہاں تک کہ عنصر جن چیزوں
کو کہا جاتا ہے وہ بھی مجرد نہیں بلکہ مرکب ہیں اور ہر عنصر اپنی جگہ

عناصر سے مرکب ہے۔ اگر زندگی محض ترکیبِ عناصر کا نام ہے
تو ہر جسم کائنات کو آپ زندہ کیوں نہیں کہتے؟ جس کو آپ مردہ
کہتے ہیں ترکیبِ عناصر اس میں بھی موجود ہے۔ آب و خاک و
آتش و ہوا سب اپنی جگہ ہیں اور ایسے ممتزج ہیں کہ الگ
کوئی بھی چیز نظر نہیں آسکتی۔ صرف وہ حرارت زائل ہوئی ہے
جو روح کی وجہ سے تھی ورنہ عنصری حرارت مطلقاً زائل
نہیں ہوتی۔ ورنہ گوشت کا مزاج گرم نہ ہوتا اور کھانے والے
کے جسم میں وہ گرمی پیدا نہ کرتا۔ پھر آپ اس کو مردہ کہتے کیوں
ہیں۔ آپ کی اس منطق سے تو زندہ مُردہ کی تفریق ہی غلط
ہے، سب ہی زندہ ہیں۔ اگر جسم مردہ سے ترکیبِ عناصر
مفقود ہو گئی ہوتی تو جسم مردہ کے اعضا، حتیٰ کہ دل آج
زندہ جسم کا جُز، کیسے بنائے جاتے۔ جسمِ مُردہ کے اعضا آج
زندوں کو اس ہی لیے تو دیے جا رہے ہیں کہ ان اعضاء مردہ
میں ترکیبِ عناصر تو سب موجود ہے فقط روح نہیں ہے
جب یہ اعضاء با روح انسان کو دے دیے جاتے ہیں

تو اس کی روح ان اعضاء بے روح میں بھی جاری و ساری ہو جاتی ہے۔ زندہ کا خون لے کر محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اس میں ترکیب عناصر موجود ہے لیکن بے روح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک وہ سرنج یا شیشی میں ہے بے حرکت ہے اب اس میں دوران اور گردش نہیں کیونکہ روح نہیں حرکت میں لانا روح کا کام ہے۔ وہ خون جب کسی روح کے سپرد کیا اور جسم زندہ میں داخل ہوا تو فوراً حرکت میں آ گیا اور رگوں میں دوڑنے لگا۔ لہٰذا یہ غلط ہے کہ زندگی محض ترکیب عناصر کا نام ہے۔ آپ کا یہ فرمانا کہ از روئے قرآن زندگی ترکیب عناصر سے عبارت ہے یہ آپ کو کس آیت قرآنی نے بتایا ہے۔ آپ نے شاعرانہ تخیل کو تو قرآن نہیں سمجھ لیا کیونکہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

کیا اس طرح کے اشعار کو آپ قرآن کریم سمجھ بیٹھے ہیں؟

حالانکہ قرآن کہاں اور شعر کہاں؟ مَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُبِينٌ ۝

قرآن کریم نے ترکیب عناصر کو زندگی نہیں کہا

قرآنِ کریم فرماتا ہے:۔

ثُمَّ خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظاماً فكسونا العظام لحماً ثم انشاناه خلقاً آخر فتبارك الله احسن الخالقين ۝

"پھر ہم نے نطفہ کو منجمد خون بنایا پس ہم نے منجمد خون کو لوتھڑا بنایا، پس ہم نے لوتھڑے کو ہڈیاں بنایا، پس ہم نے ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا، پھر ہم نے کچھ دیر میں اس کو ایک دوسری پیدائش (روح) دی، پس باعظمت ہے اللہ جو بہترین خالق ہے"۔ الفاظ سے کیسے کر نطفہ سے خون اور خون سے لوتھڑا اور لوتھڑے

سے ہڈیاں اور ہڈیوں پر گوشت، یہ تمام مراحل کیا ترکیبِ عناصر کے بغیر ہی طے ہو رہے تھے؟ ہرگز نہیں۔ لیکن ان تمام مراحل طے ہونے پر بھی وہ زندہ نہیں تھا۔ یہ دوسری پیدائش جس کو کہا گیا ہے یہ روح ہی تو ہے، جو اب تک نہ تھی۔

قرآن میں روح بمعنی انسانی جان، ملاحظہ فرمایئے

کیا یہ آیتِ قرآنی اب تک آپ نے نہیں دیکھی؟ فاذا سوّیتہ ونفخت فیہ من روحی فقعوالہ ساجدین (اے فرشتو) جب میں جسمِ آدمؑ کو مکمل کر دوں اور اس جسم میں اپنی پیدا کی ہوئی روح پھونک دوں تو تم فوراً اس کے لیے سجدہ کرتے ہوئے جھک جانا۔" پہلے اللہ تعالیٰ نے سوّیتہ فرمایا یعنی "جب میں اس جسم کو مکمل کر لوں" ظاہر ہے کہ جسم کی تکمیل ترکیبِ عناصر کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد فرمایا کہ "اور جسم میں اپنی روح پھونک دوں تو پھر سجدہ میں دیر نہ ہو۔" یہاں روح سے مراد انسانی جان نہیں تو اور

کیا ہے؟ کہ جس کا ادراک فوراً فرشتوں کو ہو سکے۔ یہاں روح سے مراد وحی، قرآن، روح القدس، روح الامین تو نہیں ہو سکتا جس کو جسمِ آدم میں پھونکا جا رہا ہو۔ اول تو جسم بیجان پر وحی، علم، حکمت وغیرہ کا القا کیا۔ دوسرے ان چیزوں کا فوری ادراک فرشتوں کو ہو کیسے سکتا ہے کہ اب اس جسم میں وحی اُتر آئی یا علم و حکمت کا القاء ہو گیا۔ کسی جسم بے جان کا باروح ہونا تو اسی صورت میں معلوم ہوا کرتا ہے کہ جو جسم اب تک بے حرکت تھا اب حرکت میں آگیا اور ہلنے جلنے لگا۔ اسی طرح جسمِ زندہ کے مردہ ہونے کا علم ہوتا ہے کہ جسمِ متحرک اب ساکن ہو گیا اور سانس کی حرکت تک ختم ہو گئی لہٰذا بے جان کا جاندار ہونا اور جاندار کا بے جان ہونا حرکت اور سکون ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ اس حرکت و سکون سے علم اور وحی کے نزول و انقطاع کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ یہ بات الگ ہے کہ ہر روحِ زندگی کے خصوصیات الگ الگ ہوتے ہیں۔ پرندوں کی روحِ زندگی میں پرواز کی طاقت ہے۔ مچھلی کی روحِ زندگی میں

تیرنے کی طاقت ہے انسان کی روح زندگی میں نطق وفہم کی طاقت ہے۔ نبیؐ کی روح زندگی میں کمال نبوت، علم وحکمت کی طاقت ہے اس لیے آدم کی روح زندگی اپنے ساتھ کمالات نبوت لے کر آرہی ہے لیکن اصل شے تو زندگی ہے اور ادراک کرنے والوں کو سب سے پہلے تو زندگی ہی کا ادراک ہوگا۔ نبوت اور کمالاتِ نبوت کا تو فوری ادراک نہیں ہوسکتا

جب قرآنِ کریم میں روح بمعنیٰ وحی وغیرہ آتا ہے تو وہاں لفظ نفخ نہیں آتا

بے شک قرآنِ کریم میں لفظ روح کہیں بمعنیٰ وحی ہے کہیں بمعنیٰ ملک ہے کہیں بمعنیٰ روح القدس اور روح الامین ہے لیکن ایسے کسی موقع پر لفظ روح کے ساتھ لفظ نفخ (پھونکنا) نہیں آتا بلکہ ایسے مواقع پر لفظ تنزیل، انزال، نزول، القاء، ارسال وغیرہ استعمال ہوتا ہے۔ بطور مثال دیکھیے:۔ ا۔ ینزّل الملائکۃ بالروح علیٰ من یشاء

من عبادہٖ ۔ (۲) یلقی الروح من امرہٖ علیٰ من یشاءُ من عبادہٖ ۔ (۳) وکذالک اوحینا الیک روحًا من امرنا ۔ (۴) فارسلنا الیھا روحنا فتمثّل لھا بشرًا سویًّا ۔

لیکن جب لفظ نفخ کے ساتھ یا روح کے ذکر میں لفظ نفخ (پھونکنا) آتا ہے تو وہاں لفظ روح صرف بمعنیٰ جان ہے جس کی مثال ہم جناب آدم کے بارہ میں دے چکے پھر روح بمعنیٰ جان اسی لفظ نفخ کے ساتھ حضرت عیسیٰ کے بارہ میں ہوتا ہے۔ مریم ابنت عمران التی احصنت فرجھا فنفخنا فیہ من روحنا۔ ہم مریم دختر عمران کی مثال دیتے ہیں جس نے اپنی پاک دامانی کی حفاظت کی پس ہم نے اس میں اپنی ایک روح پھونک دی۔ پھر فرمایا جاتا ہے۔ انّما المسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ وکلمتہ القھا الیٰ مریم وروحٌ منہ۔ عیسیٰ بن مریم تو صرف اللہ کے رسول ہیں

اور اللہ کا ایک بول ہی ہے جس کو اللہ نے مریم کی طرف
ڈالا اور اللہ کی جانب سے ایک روح ہیں یعنی ایک
جان ہیں۔ پھر حضرت عیسیٰؑ ہی کے بارے میں فرمایا جاتا ہے
واذ تخلق من الطین کہیئۃ الطیر باذنی
فتنفخ فیھا فتکون طیرا باذن اللہ۔ اے عیسیٰؑ
جب تم مٹی سے پرندہ کی شکل کی طرح ایک شکل بناتے
تھے میرے اذن سے پس تم اس میں (روح) پھونک دیتے
تھے پس وہ اللہ کے اذن سے پرندہ ہو جاتا تھا۔ پھر
ایسے ہی کلمات سورۂ آلِ عمران میں جناب عیسیٰؑ کی زبانی
قرآن نے بیان فرمائے۔ انی اخلق لکم من الطین
کہیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن
اللہ۔ میں پیدا کرتا ہوں۔ تمھارے لیے ایک پرندہ کی
شکل پس اس میں (روح) پھونکتا ہوں۔ پس وہ اذنِ خدا
سے پرندہ ہو جاتا ہے۔ غرضکہ آیاتِ قرآنیہ سے بالکل
واضح ہو رہا ہے کہ جب لفظ روح وحی وغیرہ کے لیے آتا

ہے وہاں لفظ نفخ نہیں آتا۔ کیونکہ وحی اور اس کی مثل یہ
ایسی چیزیں نہیں کہ ان کو کسی جسم میں پھونک کی طرح بھرا جائے
لیکن جب روح کا ذکر جان کے معنی میں ہوتا ہے تو وہاں
لفظ نفخ (پھونکنا) آتا ہے یا جب کسی انسان کو روح کہا جاتا ہے
تو وہاں بھی لفظ روح جان ہی کے معنیٰ میں آتا ہے۔ کیونکہ انسان
بذاتِ خود عین وحی یا عین علم نہیں ہے۔

ہمارے مخاطب کا یہ فرمانا کہ قرآنِ کریم نے لفظ'
روح بمعنیٰ جان کہا ہی نہیں قرآنِ کریم بار بار ان کے اس
دعوے کی تردید کر رہا ہے۔ اب مخاطب اپنی قرآن فہمی
کا خود فیصلہ کریں اور سوچیں کہ وہ کس طرح دفترِ قرآن کو
الٹ پلٹ کرنے کا نام انھوں نے رکھا ہے تفسیر القرآن
بالقرآن۔ قرآنِ کریم ہمارے مخاطب سے بزبانِ حال کہہ
رہا ہے ؎

سورتیں الٹی تھیں اب معنیٔ قرآں الٹے
ہاتھ روکو نہ کہیں دفترِ امکاں الٹے

امامبارڑہ عباسیہ چوک برفخانہ فلیمنگ روڈ لاہور پر ہمارے مخاطبِ محترم کا عتاب

مخاطبِ محترم فرماتے ہیں:-

"ہمارے شیعہ دوستوں کا ایک امام بارڑہ عباسیہ نام کا چوک برف خانہ فلیمنگ روڈ لاہور میں ہے جس کی دیواروں پر سرِ بازار ائمہ سلامؑ علیہم کے اسمائے گرامی اور جناب امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کے اشعار مرقوم ہیں جن میں ایک لمبی نظم سامنے کی دیوار پر لکھی ہے۔ یوں تو اس نظم کا ہر شعر خلافِ قرآن ہے لیکن ایک شعر میں یہ تصور دیا گیا ہے کہ خدا تعالےٰ نے جبریلِ امین کو حضرت علیؑ کی طرف بھیجا تھا لیکن وہ محمدؐ کے پاس چلا گیا۔ شعر یہ ہے خود موقع پر پہنچ کر ملاحظہ فرمائیں۔ اگر رات

کا وقت ہو تو ٹارچ ہمراہ لے جائیں۔ بالکل سامنے لکھا پائیں گے ؎

جبریل کہ آمد زپسِ خالقِ بے چوں
در پیش محمدؐ شدہ مقصود علی بود

کیا امامیہ مشن اسے مٹا کر عنداللہ ماجور ہوگی"

ہمارے مخاطبِ محترم کو ائمہ سلامؑ علیہم اور امیرالمومنین کے فضائل کے اشعار کا سرِ بازار ہونا زیادہ دکھ دے رہا ہے۔ شاید انھوں نے فضائلِ علیؑ مرتضیٰؑ کی ضد میں اس قرآن کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے جس میں صرف علی مرتضیٰؑ کی شان میں تین سو آیات مدح ہیں جیسے کہ عالم اہلسنت حضرت احسن جامی فرماتے ہیں ؎

منم سُنّی ولیکن از تعصب الاماں گویم
پسندِ خاطرم انصاف از دنیا وما فیہا
ز تفسیرِ کلام اللہ چو می پرسی شود ناطق
کہ سہ صد آیہ نازل شد لشانِ شوہرِ زہراؑ

غالباً ہمارے مخاطبِ محترم اس قرآن کے ماننے والے ہیں جس میں علی مرتضیٰؑ اور ائمہؑ کی کوئی فضیلت ہی نہیں ہے تب ہی تو وہ فرماتے ہیں۔ "اس نظم کا ہر شعر خلافِ قرآن ہے" بے شک آپ کے قرآن کے ضرور خلاف ہوگا۔ رہا وہ تصور جو شعر مذکور سے مخاطبِ محترم نے اخذ فرمایا ہے۔ اس کے متعلق تو میں بعد میں عرض کروں گا، اس سے پہلے یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ تصور آپ کے نظریہ کے مطابق کیا غلط ہے جبکہ آپ یہ طے فرما چکے کہ بلاغ القرآن منزہ عن الخطاء محض ذاتِ باری کو مانتا ہے۔ جب ذاتِ باری کے سوا کوئی بھی منزہ عن الخطا نہیں تو جبریل بھی ایک فرشتہ ہی تو ہیں ذاتِ باری تو نہیں ہیں۔ اگر خطا کر جائیں اور علیؑ کے بجائے محمدؐ کے پاس پہنچ جائیں تو یہ آپ کے مسلک کی تائید اور مطابقت ہے۔ البتہ میرے اور صاحبِ شعر کے مسلک کے یہ تصور بالکل خلاف ہے جو تصور آپ نے شعر مذکور سے اخذ فرمایا ہے وہ شعر کو

نہ سمجھنے کی بنا پر ہے۔ شاعر کی نگاہِ تصور شبِ ہجرت نبی اکرمؐ کے بیت الشرف کی طرف ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ نبیؐ کے فرشِ رشکِ عرش پر علی مرتضیٰؑ خوابِ راحت میں ہیں اور خود نبی اکرمؐ مکہ سے جدا ہو کر راہِ مدینہ میں ہیں۔ علیؑ کہیں ہیں نبیؐ کہیں ہیں۔ جبریل امین علی مرتضیٰؑ کی شان میں آیۂ من الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ واللہ رؤف بالعباد لے کر نبی کریم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں کیونکہ منزل وحی سرکار ہیں علیؑ نہیں ہیں اور وہ وحی الٰہی جس کے مقصود علیؑ ہیں نبیؐ تک پہنچاتے ہیں اور یہ صورت صرف ایک اسی آیت کی نہیں وہ تین سو آیات جن سے قدرت کو مدح علیؑ مقصود ہے نبیؐ ہی پہ نازل ہوئیں جبکہ مقصودِ آیات ہے علیؑ کی ذات۔

آپ نے شعر کے کس لفظ سے یہ مطلب پیدا کیا کہ جبریلؑ کو آنا تو تھا علیؑ کے پاس مگر وہ غلطی سے محمدؐ کے پاس پہنچ گئے۔ شاعر کا تو صرف یہ مطلب ہے کہ وحی آئی نبیؐ پر اور مقصود

وحی علیؑ تھے کیونکہ مقصود علیؑ کی مدح تھی۔ اتنا صاف شعر
بھی آپ سمجھنے کی کوشش نہ کریں اور نہ سمجھ سکیں۔ جو آپ کی ہی
طرح کے ایک انسان کا کلام ہے تو اللہ کا کلام جہاں متکلم بھی
بے مثل اور کلام بھی بے مثل وہ آپ کی سمجھ میں کیسے آسکے گا۔
اگر علیؑ اور اولادِ علیؑ کے ناموں کی وجہ سے آپ کو امام بارہ
عباسیہ سے ضد ہے اور آپ کو تمنا ہے کہ وہ مٹا دیے جائیں
تو آپ یہ نام کہاں کہاں سے مٹائیں گے۔ نبی کریمؐ نے تو شب
معراج عرش پر لکھا ہوا دیکھا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ
اللّٰہِ اَیَّدْتُہٗ بِعَلِیٍّ۔ "اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، محمدؐ
اللہ کا رسول ہے، میں نے محمدؐ کی تائید و نصرت کی ہے علیؑ
کی ذات سے۔" (شفاء قاضی عیاض اور تفسیر درِ منثور سیوطی)
"پیامِ عمل" سے آپ چاہتے ہیں کہ وہ فضائلِ اہلِ بیتؑ اور ان
کے اسماءِ گرامی کو امام بارہ عباسیہ سے مٹا دیں۔ یہ عمل آپ ہی
کو مبارک ہو، ہم ان کے فضائل کو مٹانے والے نہیں بلکہ اپنے
لوحِ دل پر نقش کیے ہوئے ہیں۔ البتہ آپ عرشِ خدا سے

علیؑ کا نام مٹا دیں تو ہم جانیں۔ اگر جنت کی طرف آپ کا
گزر ہو تو بابِ جنت کو بھی اچھی طرح دیکھ لیجیے گا اور کسی
ٹارچ سے پہلے دیکھ لیجیے گا کہ وہاں تو یہ نام لکھے ہوئے نہیں۔ اگر
کہیں وہاں بھی امام بارہ عباسیہ کی طرح یہی نام ہوئے تو نہ معلوم ایسی
جنت کو بھی آپ اپنے لیے پسند کریں گے یا نہیں اور ایسی جنت آپ
کو بھی پسند کرے گی یا نہیں۔

مخاطبِ محترم کی ایک نئی ایجاد کہ جو کچھ کرتا ہے جسم کرتا ہے روح کوئی چیز نہیں

چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"روح کے متعلق ایک تصور یہ بھی دیا جاتا ہے
کہ جسمِ انسانی میں اصل حاکم تو ہے روح جسم یا
اعضاء تو محض اوزار ہیں جن سے وہ کام لیتا
ہے یعنی بالکل اسی طرح جیسے ترکھان حاکم اور
آری تیشہ اس کے اوزار۔ اگر ترکھان کسی کا شہتیر

کاٹ کر ناکارہ کر دے تو قصور ترکھان کا ہے آری کا نہیں۔ یہ روح کے وجود کی بڑی قاطع دلیل لائی گئی ہے لیکن قرآن کی رو سے انسانی جسم پر صادق نہیں آتی۔ جیسے اللہ نے بے حیائی کی سزا سو کوڑے رکھی ہے جو روح کی نہیں بلکہ جسم کو لگانے کا حکم دیا ہے۔ فلہذا جو کچھ ہے جسم ہی میں ہے۔"

ہمارے مخاطب کا دعویٰ یہ ہے کہ روح تو کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ اچھا برا جو کچھ کرتا ہے جسم کرتا ہے۔ یہ ہمارے مخاطب کا نظریہ (اگرچہ ان کا آخری جملہ "فلہذا جو کچھ ہے جسم ہی میں ہے" گول مول جملہ ہے۔ وہ جو کچھ جو جسم ہی میں ہے اس ہی کا نام تو روح ہے۔ وہ جو کچھ روح کے سوا اور کیا ہے؟ وہی روح ہے جو جسم میں آتی بھی ہے جاتی بھی ہے) اگر کسی شخص نے دن کو رات اور رات کو دن کہنے والا کبھی نہ دیکھا ہو تو وہ ہمارے مخاطب عزیز کو دیکھ لے۔ دنیا کا ہر عالم و جاہل خوب جانتا

کہ فاعل افعال روح ہے۔ جسم چونکہ تابع روح ہے اس لیے وہ روح کا اسی طرح آلہ کار ہے جس طرح صناعوں اور کاریگروں کے اوزار۔ فرق اتنا ہے کہ اوزار بیرونی چیزیں ہیں اور اعضاء ہیں روح کا داخلی عملہ جس کو فطرت نے روح سے وابستہ کر دیا ہے۔ ہاتھ پیروں میں نہ فہم ہے نہ خواہش نہ ارادہ۔ ان کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ جو کچھ کر رہے ہیں کس لیے کر رہے ہیں؟ ہلانے والا ان کو ہلاتا ہے تو وہ ہل جاتے ہیں، ٹھہراتا ہے تو وہ ٹھہر جاتے ہیں۔ روح کی حکومت ہے یہ اس کے تابع ہیں۔ اتنی صاف اور صریح بات کے لیے نہ کسی ثبوت کی ضرورت نہ کسی دلیل کی احتیاج مگر ہمارے مخاطب عزیز اس بدیہی بات کے بھی منکر ہیں جو ایسی بدیہی بات سے انکار فرما دیں۔ ان کا کسی عقلی اور علمی بات کا انکار کیا کوئی تعجب خیز ہو سکتا ہے؟ فرماتے ہیں:-

"اللہ نے بے حیائی کی سزا سو کوڑے رکھی ہے
جو روح کی نہیں بلکہ جسم کو لگانے کی سزا ہے۔"

ہمارے مخاطب زانی کے بدن پر سو کوڑوں کی سزا سے
یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ گنہگار بدن ہے اس لیے کوڑے
بھی بدن پر لگائے جاتے ہیں لیکن وہ یہ بھول گئے کہ جن اعضاء
نے زنا کیا ہے وہ کوڑوں کے لگائے جانے کے وقت بھی بالکل
محفوظ اور مستور رکھے جاتے ہیں۔ کوڑے ان اعضاء پر نہیں
لگائے جاتے جو زنا کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ کیا یہ کوڑے
مرد کے اس عضو پر لگائے جاتے ہیں جس نے بے حیائی کی ہے
یا عورت کے اس عضو کے داخلی حصہ میں لگائے جاتے ہیں جو
صرف بے حیائی ہی تھا؟ تہمت زنا کی سزا میں بھی کوڑے لگائے
جاتے ہیں لیکن کیا منہ سے اس زبان کو نکلوا کر جس نے تہمت لگائی تھی؟
شرابخواری کی سزا میں بھی کوڑے ہیں۔ لیکن کیا اس منہ کے اندر
جس نے شراب پی ہے؟ اچھا یہ بھی کہیے کہ جب سزا جسم کی ہے
روح کی نہیں ہے تو اگر دس کوڑوں ہی میں مجرم کی جان نکل گئی
تو کیا باقی کوڑے روح نکل جانے کے بعد بھی جسم مردہ پر مارے
جائیں گے یا اگر مجرم سزا پانے سے پہلے مر گیا تو کیا مرنے کے پیچھے

سو دُرّے لگائے جائیں گے؟ اس سلسلہ میں ایک چور کی
حکایت یاد آئی جو مساجد اور محافل وغیرہ سے جوتے چرایا کرتا تھا
ایک مرتبہ وہ پکڑا گیا۔ قاضی نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ چور نے
بحلف کہا کہ ان ہاتھوں نے کبھی چوری نہیں کی۔ چور کے کسی ہمراز دا
نے آہستہ سے کہا کہ تم کو جوتے چراتے ہوئے برس گزر گئے اور اب
تم جھوٹا حلف اٹھا رہے ہو۔ چور نے بھی آہستہ سے جواب دیا
کہ میری قسم غلط نہیں ہے۔ میں نے کبھی کوئی جوتہ ہاتھ سے نہیں
چرایا بلکہ اچھا جوتہ دیکھا تو بغیر جھجکے پاؤں میں ڈالا اور چل دیا۔
میرے عزیز، چور کی سزا میں بھی ہاتھ کا کاٹنا اس لیے نہیں
کہ ہاتھ سے چوری کی تھی بلکہ اس لیے ہے کہ چور ہر معاشرہ اور
ہر جگہ کے لیے خطرناک ہے۔ ہر شخص کٹا ہوا ہاتھ دیکھ کر جان
جائے کہ یہ شاطر بدمعاش ہے جس کو بار بار کی چوری میں یہ سزا
ملی ہے۔ اگر اس کو کوڑوں کی سزا ملے تو یہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ
ہر شخص کے لیے شناخت کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے
نزدیک تو مذکورہ حکایت کے چور کے پیر کاٹنا ہوں گے۔ اس

لے پیروں سے چوری کی تھی ۔ اور تہمت لگانے والے کی زبان پر
کوڑے لگائے جائیں گے اور شرابخوار کے منہ میں اور زانی و زانیہ
کے دوسرے اعضا پر ۔ باقی بدن تو بے گناہ ہے ۔ سمجھ میں
نہیں آتا کہ ایک قابل انسان کیوں یہ سب خرافات مول لے رہا
ہے ۔ روح کے بجائے جسم بے شعور کو فاعلِ افعال کہنا روح
کے وجود سے مرنے کے بعد ہی نہیں بلکہ زندگی میں بھی انکار کرنا اور
اپنی سخن پروری سے یہ تاثر دینا کہ مردہ تو مردہ زندہ میں بھی روح
کوئی چیز نہیں حیاتِ شہداء سے انکار کی غلطی ان سب کا
باعث بن رہی ہے ۔

بے حیائی کی سزا میں جو سو کوڑے بدن پر لگائے جاتے
ہیں محض اس لیے کہ جس روح نے جرم کیا ہے وہ اس بدن
سے الگ نہیں ہے ۔ اسی جسم میں ہے ۔ سزا روح کی ہے جسم کی
نہیں ہے ۔ اگر کوڑوں کے پورا ہونے سے پہلے روح نکل گئی تو
اب سزا میں کوڑے نہیں لگائے جا سکتے ۔ کیونکہ گنہگار اس جسم
میں نہ رہا ۔ اب صرف جسم بے گناہ رہ گیا ۔ سیدۂ طاہرہ حضرت

فاطمہ زہرا کے گھر جلانے کا جو سامان بعدِ رسول ہو رہا تھا وہ اس
لیے تو نہ تھا کہ دوسرا فریق اس گھر کو گنہگار سمجھ رہا تھا ، اس کا عتاب
اور تشدد تو گھر والوں پر تھا ۔ گھر کو تو صرف گھر والوں کی وجہ
سے جلانے کا ارادہ تھا ۔ جنابِ والا میدانِ قتال میں قتال
ہوتا ہے باہم انسانوں میں ، کسی کے لباس اور پوشش سے قتال
نہیں ہوتا لیکن چونکہ کوئی بھی انسان بے لباس اور بے پوشش
نہیں ہوتا اس لیے اس انسان کی وجہ سے اس کے لباس اور
پوشش کو پہلے کاٹا جاتا ہے ۔ اس کا لباس اگر اس کے جسم سے
الگ کہیں رکھا ہو تو اس کو کون کاٹے گا ۔ جس طرح جسم کا لباس
اس کا جامہ اور ملبوس ہے اسی طرح روح کا لباس اس کا
جسم ہے ۔ جسم برابر بہ تحلیل ہوتا رہتا ہے ۔ پہلے اجزائے جسم
ختم ہو کر نئے اجزا شاملِ جسم ہوتے رہتے ہیں اور ایک مدت
کے بعد بالکل کایا پلٹ ہو جاتی ہے ۔ بعض اوقات مجرم
برسوں کے بعد ہاتھ آتا ہے ۔ اگر مجرم پچاس برس کے بعد بھی
ملے گا تو بے حیائی کی سزا میں اب بھی سو کوڑے جسم ہی پر لگانے

جائینگے حالانکہ جرم کے وقت جو جسم تھا اب وہ کچھ سے کچھ ہو چکا ہے جرم کے
وقت کے اجزاء بدن زائل ہو چکے اور ان کی جگہ دوسرے اجزاء ہو گئے جرم کے وقت
جسم اور تھا وزن اور تھا، اب جسم اور وزن جسم اور ہے لیکن ہزاروں تبدیلی کے
باوجود کوڑے لگائے جائینگے کیوں جسم بدل گیا لیکن جسم میں روح وہی ہے جس نے
جرم کیا تھا اگر سزا جسم کی ہوتی تو اس بجرم سے ہوئے بدلے جسم کو سزا نہ دی جاتی آپ نے
دوزخ میں جلنے کے لیے قرآنی آیت نہیں دیکھی اللہ فرماتا ہے کہ اہل جہنم کی کھال جل جائے
گی اور ہم اس کھال کی جگہ دوسری کھال بدلتے رہیں گے یہ آنکھیں کر دینے والی خبر کی
بدلی ہوئی کھال وہ تو نہیں جو جرم کے وقت تھی۔ تو کیا کرے کرنی
بھرے کوئی، نہیں سزا اصل میں روح کی ہے۔ وہ روح جس
لباس میں بھی ہو۔ چونکہ ایمان، کفر، نیکی، بدی سب روح
کے افعال ہیں اور ان افعال کی مکمل جزاء کا دن یوم الدین اور
روز قیامت ہے۔ اس لیے ہر روح کا مومن کی ہو یا کافر کی
نیک کی ہو یا بد کی اس کا جزاء کے لیے قیامت تک باقی
رہنا ضروری ہے۔ اگر مرنے کے بعد روح معدوم محض ہو
گئی اور مطلقاً فنا ہو گئی تو جزا پائے گا کون؟ خداوند عالم

اس جیسی روح تو ہزار بار پیدا کر سکتا ہے مگر یہ پیدا کی ہوئی
روح وہ تو نہ ہوگی جس نے نیکی، بدی کی تھی۔ اس لیے ہم
بعد مردن ہر روح کی بقاء کے قائل ہیں تا کہ امر جزاء معطل
نہ ہو جائے اور ایمان بالقیامۃ برائے نام نہ رہ جائے روح
مومن کی ہو یا کافر کی مرنے کے بعد اس کو جزا پانے کے لیے
باقی رکھا جاتا ہے۔ ہمارے مخاطب تو زندگی میں بھی روح
نامی چیز کے منکر ہیں اور مرنے کے بعد تو ان کے نزدیک نبیؐ
ہوں یا عام افراد ہر ایک معدوم محض ہے۔ اس کی روح تک
فنا ہو چکی پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا نبیؐ کے لیے یا ائمہؑ
کے بار بار سلام علیہ اور سلام علیہم لکھنا یہ کیا ہے وہ کس کو
سلام کہہ رہے ہیں؟ ان کو جن کی روح اول تو کبھی بھی نہ تھی اور
اب تو وہ مطلقاً معدوم ہے پھر یہ سلام کیسا اور کس پر؟
مخاطب محترم نے محض اس بناء پر کہ ہم ہر مومن و کافر کی روح
کو معدوم نہیں سمجھتے ایک طرف تو یہ الزام دیا ہے کہ ہم ہر
متوفیؑ کو زندہ سمجھتے ہیں۔ پھر شہداء کی تخصیص کیا رہی۔

جناب والا روح کا موجود ہونا اور بات ہے اور اس کا زندہ ہونا اور بات ہے۔ ہم ہر متوفیٰ کو زندہ نہیں سمجھتے عام مرنے والوں کی روح رہتی ہے لیکن مرنے کے بعد وہ ہر عمل سے معطل کی جا چکی ہے۔ اب وہ کوئی عمل نیک یا بد کر نہیں سکتی اس کا تعلق دارِ عمل سے اُٹھ گیا لیکن وہ متوفیٰ جو بعد وفات زندہ ہیں وہ مقامِ عمل میں ہیں اور عملِ خیر میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ رزق پاتے ہیں جبکہ عام مرنے والے ان تمام امور سے معطل ہیں۔ دوسری طرف ہمارے مخاطب نے روح کے موجود رہنے پر یہ اعتراض فرمایا ہے کہ ہم نے خدا کے مقابلہ میں روح کو بھی باقی سمجھ لیا جبکہ اس کو فانی سمجھنا چاہیے تھا یہ اعتراض بقاء اور فنا کے مفہوم کو نہ سمجھنے کی بناء پر ہے۔ اللہ کو باقی اس کی موجودگی کی بنا پر نہیں کہا جاتا بلکہ اللہ باقی ہے، اس معنیٰ سے کہ نہ اس کی فنا ممکن ہے نہ کوئی اس کو فنا کرنے پر قادر ہے اور اللہ کے سوا ہر شے فانی ہے اس معنیٰ سے کہ اس کی فنا عقلاً ہر وقت ممکن ہے اور اللہ ہر وقت

اس کی فنا پر قادر ہے یہ مفہوم ہے کہ جس کی بنا پر کوئی بھی موجود اللہ کے سوا باقی نہیں بلکہ ہر موجود اپنی موجودگی میں بھی فانی ہے باقی بالذات صرف خدا ہے اس کے سوا جس کو اور جب تک اللہ موجود رکھے وہ ضرور موجود رہے گا یہ بقاء اور یہ وجود بالذات نہیں بلکہ تحتِ مشیتِ پروردگار ہے۔ وجود تو وجود ذی حیات کا قیام و قعود بھی اس کی اپنی طاقت نہیں بحول اللہ و قوتہٖ اقوم و اقعد۔

شہداء شہادت کے بعد بھی زندہ رہ کر طلبگارِ آخرت رہتے ہیں

ہمارے مخاطبِ محترم نے تحفظِ ناموسِ صحابہ نمبر ۶۱ پر یہ مانا ہے کہ جنگِ احد میں مسلمانوں کا کوئی دستہ کسی جگہ مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ''کہ جب فتح ہو گئی تو اس دستہ کے اپنے افراد میں اس مقام کو چھوڑ دینے اور نہ چھوڑنے میں اختلاف ہو گیا یعنی جس دستہ کی غلطی سے مصیبت آئی تھی

اس میں بھی سارے قصوروار تھے" ص ۶۰ پر لکھتے ہیں کہ جنگ
احد میں جس جماعت سے ادائے فرض میں کوتاہی ہوئی خدا تعالیٰ
نے اس کے اظہار میں ان کی رعایت نہیں کی اس نے تو اپنے
برگزیدہ نبیوں کے سہو پر بھی پردہ نہیں ڈالا" یہ اشارہ محترم
کا اسی ہی دستہ کی طرف ہے جس کو نبی نے پہاڑ کی گھاٹی پر مقرر
کیا تھا جن کی اکثریت نے خلاف حکم نبوی اپنی جگہ چھوڑ دی اور
مخاطب محترم نے ان کی اس کارگزاری پر ان کو انبیاء کا جگہ
جگہ ہم پلہ بتانے کی کوشش کی۔ بہر حال بڑے گھوم پھیر سے
یہ مان لیا ہے کہ یہ آیت اس ہی دستہ کے بارہ میں آئی۔
حتیٰ اذا فشلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم
من بعد ما اراکم ما تحبون منکم من یرید
الدنیا ومنکم من یرید الآخرۃ۔ یہاں تک
کہ تم نے ہمت ہار دی اور امر نبی کے بارہ میں تم نے تنازع
کیا اور جس وقت اللہ نے تمہاری محبوب فتح دکھا دی تم
نے نافرمانی کی تم میں سے کچھ دنیا چاہتے ہیں اور کچھ آخرت

چاہتے ہیں۔ یہ سب لفظ اس ہی دستہ کے بارہ میں ہیں فشلتم
تم نے ہمت ہار دی۔ تنازعتم فی الامر تم نے حکم نبی
کے بارہ میں تنازع کیا عصیتم تم نے نافرمانی کی یہ سب ماضی
کے صیغے ہیں۔ اب اس کے بعد ان نافرمانوں کے لیے جنہوں
نے خلاف حکم نبوی اپنی جگہ چھوڑ دی فرمایا منکم من
یرید الدنیا اور ان فرماں برداروں کے لیے جو نبی
کی فرماں برداری میں اپنی جگہ رہ کر شہید ہو گئے فرمایا ومنکم
من یرید الآخرۃ، پہلے کے تمام صیغے ماضی کے
تھے۔ مگر نافرمانوں کی طلب دنیا اور فرماں برداروں کی طلب
آخرت کے لیے ماضی کا صیغہ نہیں بلکہ مضارع اور استمرار کا
صیغہ استعمال کر کے بتا دیا کہ جنہوں نے حب دنیا میں نافرمانی
کی تو وہ نافرمانی محض کی ہی نہیں بلکہ کریں گے بھی یہ عمل محض ماضی
نہیں بلکہ استمرار عمل ہے اور جنہوں نے حب آخرت میں جانیں
دے دیں ان کی طلب آخرت محض ماضی ہی نہیں ہے بلکہ مستمر اور
جاری رہنے والی ہے۔ یہ شہداء بعد شہادت بھی طالب آخرت

رہیں گے یعنی عملِ خیر، اللہ کی اطاعت و عبادت کرتے رہیں
گے۔ ورنہ دونوں جگہ پہلے الفاظ کی طرح لفظ اَرَادَ بصیغہ
ماضی آتا اور اس کا مفہوم یہ ہوتا کہ تم میں سے بعض نے
ارادۂ دنیا کیا اور تم میں سے بعض نے ارادۂ آخرت کیا
اگر شہداء کا ارادۂ آخرت ان کی شہادت پر ختم ہو چکا ہوتا
اور وہ شہید ہو کر مردہ ہو چکے ہوتے تو ان کا ارادۂ آخرت
صیغۂ مضارع اور فعلِ استمراری میں کیوں بیان فرمایا جاتا؟
کیا اللہ کو یہ معلوم نہ تھا کہ جو مر چکے تو نہ اب وہ رہے اور نہ ان
کا ارادہ رہا۔ حیاتِ شہداء کی بزبانِ قرآن یہ ایک اور شہادت
ہے۔ جن طالبانِ دنیا نے نبیؐ کی موجودگی میں حکمِ نبیؐ کی نافرمانی
کی کیا ایسے لوگوں سے بعد وفاتِ نبیؐ اس کی توقع ہو سکتی ہے کہ
یہ حکمِ نبوی کی تعمیل کریں گے۔ کوہِ اُحد کی بالائی گھاٹی سے حکمِ
نبویؐ کو پسِ پشت ڈال کر نیچے اترنے والے کفار کے دوسرے
حملہ کے وقت نچلے میدان میں ہی اگر ثابت قدم رہتے اور
میدان میں یہ لوگ حبِ آخرت کا جذبہ دکھاتے تو یہ بعید

نہ تھا کہ خدا تعالیٰ ان کی سابقہ لغزش کا ذکر ہی نہ فرماتا اور اگر
ذکر فرماتا بھی تو موجودہ استقامت کو دیکھ کر اس لغزش کو صرف
صیغۂ ماضی میں بیان فرماتا۔ اللہ تو ایسا ظالم نہیں کہ صرف وقتی
خطاء کو جبکہ خاطی لوگوں نے فوراً ہی راہِ خطا کو چھوڑ کر راہِ ثواب
اختیار کر لی صیغۂ استمرار میں بیان فرمائے جس سے ثابت ہو رہا
ہے کہ یہ لوگ جس طرح اس گھاٹی پر نہ ٹھہرے اسی طرح اب
میدان میں بھی نہ ٹھہرے بلکہ اپنے ساتھ نہ معلوم کتنوں کو اور
لے گئے۔ جب یہ لوگ گھاٹی پر تھے اس وقت منشاءِ الٰہی
یہ تھا کہ یہ لوگ وہاں سے نہ اُتریں اور اب جب اتر آئے تو
ان کا فرض تھا کہ اب میدان چھوڑ کر پھر پہاڑ پر نہ چڑھیں مگر
جس طرح یہ لوگ اترنے میں جلد باز تھے اسی طرح پھر چڑھ جانے
میں بھی جلد باز تھے۔ اترے تھے حبِ مال میں اور پھر چڑھے
تھے حبِ جان میں۔ حبِ آخرت نہ وہاں نہ یہاں۔ پھر کہاں
اور کب؟ قرآنِ کریم نے اس اتار چڑھاؤ دونوں کو بیان کر دیا
ہمارے مخاطب نے ان اترنے چڑھنے والوں کی جو شاندار

حمایت کی ہے وہ لائق صد داد ہے۔ ان کو بار بار صحابہ کہہ کر لفظ صحابہ کے وقار کو برباد کیا ہے۔ جب یہ طے شدہ ہے کہ ایسے لوگوں کے علاوہ وہ حضرات بھی تھے جنھوں نے کبھی راہِ فرار نہیں اختیار کی تو کیا ضرورت ہے کہ ایسے مخالص اور مخلص حضرات میں دوسری غیر خالص جنس کو بھی ملایا جائے۔ صحابہ یہ خالص حضرات ہوئے یا وہ بدلی ہوئی جنس۔ کھروں میں کھوٹوں کو ملائیں خود اور پھر دنیا میں شور مچائیں کہ تاریخ نے صحابہ کو داغدار بنا دیا، صحابہ کی مذمت اور منقصت کی کوئی پوچھے کہ آپ داغدار، مذمت اور منقصت والوں کو اس مقدس جماعت میں شامل کیوں کر رہے ہیں؟ ہمارے مخاطب محترم کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھیے۔ فرماتے ہیں:۔

"قرآنِ کریم نے صحابہ کی کہیں بھی مذمت و منقصت نہیں کی۔" پھر فرماتے ہیں:۔

"اسی طرح وہ آیاتِ مجیدہ جن میں صحابہ کی سہو و خطاؤں کا تذکرہ ہے وہاں بھی ان کے مکارم و

محاسن کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ فاضل مقالہ نگار (یعنی خطیب شیعہ جامع مسجد) نے جنگِ احد سے متعلقہ آیاتِ مجیدہ کو صحابہ کی ہجو اور مذمت کے ثبوت میں پیش کیا ہے حالانکہ وہی آیات سرمۂ چشمِ بصیرت ہیں۔ جیسے کہ ہم پیچھے ثابت کر آئے ہیں کہ قرآنِ کریم کی رو سے جماعتِ صحابہ کے افراد نہ ایک جیسے تھے اور نہ بشری تقاضوں کے مطابق سہو و خطا سے مبرا تھے۔ جنگِ احد میں جس جماعت سے ادائے فرض میں کوتاہی ہوئی خدا تعالیٰ نے اس کے اظہار میں ان کی رعایت نہیں کی۔ اس نے تو اپنے برگزیدہ نبیوں کے سہو و خطا پر بھی پردہ نہیں ڈالا اور ان کی بشریت کو اجاگر کر دیا ہے۔ اسی طرح کی ہیں جنگِ احد میں صحابہ کی خطا سے متعلق آیاتِ مجیدہ جنھیں مقالہ نگار نے ص ۵۳، ۵۴ پر نقل کیا ہے۔"

ناظرین نے دیکھا؛ کہ ہمارے مخاطب نے کوہِ احد سے
اترنے اور پھر پہاڑ پر چڑھنے والوں کو کیسا منہ بھر بھر کر صحابہ
فرمایا ہے حالانکہ ہم نے تو اس قسم کے افراد کے لیے لفظ صحابہ
کے استعمال سے حد درجہ پرہیز کیا ہے۔ حد ہو گئی کہ ایسے
لوگوں کو بشریت کے ذیل میں اور قرآنی مذمت کے سلسلہ میں
انبیاء خدا سے ملانے کی کوشش ہے لیکن مزہ یہ ہے کہ جب
کوئی بھلا آدمی ثابت قدم اور مردِ میدان حضرات کی ثنا
کرتا ہے تو وہ گوارا نہیں۔ اس کو مٹانے اور مٹوانے کی کوشش
اور فرمائش اس ثنا خوانی کا نام افراط، غلو اور رفض چاہے
وہ ثنا خواں امام شافعی ہی کیوں نہ ہوں۔ مثیلِ انبیاء ثابت
قدم حضرات کو کہنا تو ہو گناہ مگر پہاڑ کا نشیب و فراز ناپتے
رہنے والے ہیں مثیلِ انبیاء۔ اگر بقول مخاطب اللہ تو نے
تو اپنے برگزیدہ نبیوں کے سہو پر بھی پردہ نہیں ڈالا، تو کیا
وہ بروزِ قیامت آپ سے باز پرس نہ کرے گا کہ میں نے تو
اپنے برگزیدہ نبیوں کے بھی سہو پر پردہ نہیں ڈالا، اور تو نے

کر تو نے اپنے پسندیدہ لوگوں کے سہو پر نہیں بلکہ بالارادہ اور
دیدہ دانستہ میرے حبیب کو نرغۂ کفار میں چھوڑ جانے والوں
کے گناہِ عظیم پر ہزاروں پردے ڈالے اور در پردہ ان کو میرے
انبیاء کا ہم سر بنا دیا۔ لے دیکھ، یہ ایک لاکھ چوبیس ہزار
نبی تیرے سامنے موجود ہیں۔ کیا ان میں سے کوئی ایک بھی
ایسا ہے جو میدانِ قتال چھوڑ کر چلا گیا ہو؟ انبیاء تو میرے
انبیاء ہیں، وہ لوگ جو نبی نہ تھے مگر باخدا تھے میدانِ جہاد
تو کبھی انھوں نے بھی نہیں چھوڑا، کیا تو نے میری آخری کتاب
میں جنگِ احد ہی کے بیان کے سلسلہ میں میرا یہ بیان نہیں
پڑھا۔ وکاین من نبی قاتل معہ ربیون
کثیر فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ وما
ضعفوا وما استکانوا واللہ یحب الصابرین۔
"اور کتنے ہی نبی ہیں کہ ان کے ساتھ بہت سے اللہ والوں
نے قتال کیا تو جو مصیبت راہِ خدا میں ان پر پڑی تو نہ انھوں
نے ہمت ہاری اور نہ وہ کمزور پڑے اور نہ وہ تھکے اور

اللہ صابرین سے محبت رکھتا ہے"۔ پچھلی امتوں کے اہل ایمان والوں کی تو یہ مدح و ستائش اور امتِ مرحومہ کا یہ حال ملاحظہ فرمائیے :۔

۱۔ حتّٰی اذا فشلتم و تنازعتم فی الامر وعصیتم من بعد ما اراکم ما تحبون منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الآخرۃ۔

"یہاں تک کہ تم نے ہمت ہار دی اور نبیؐ کے حکمِ خاص میں تم نے تنازعہ کیا اور جب ہم تمھاری محبوب فتح دکھا چکے تو تم نے نافرمانی کی۔ تم میں سے کچھ ہیں جو دنیا چاہتے ہیں اور کچھ ہیں جو آخرت چاہتے ہیں۔"

۲۔ انّ الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعان انّما استزلھم الشیطان ببعض ما کسبوا ولقد عفا اللہ عنھم انّ اللہ غفور حلیم۔

"جو لوگ (احد میں) جنگ کے وقت بھاگ گئے

ان کو ان کے سابقہ کردار کے سبب سے شیطان نے میدان میں جمنے نہ دیا اور ضرور ضرور اللہ نے ان سے درگزر کیا اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔"

۳۔ اذ تصعدون ولا تلوٗن علیٰ احد والرسول یدعوکم فی اُخریٰکم۔

"جب تم (پہاڑ پر) چڑھے چلے جاتے تھے اور کسی کو پیچھا پھر کر نہ دیکھتے تھے اور رسولؐ تم کو تمھارے پیچھے سے پکار رہے تھے۔"

یہ آیات صرف جنگِ اُحد کے بارہ میں ہیں جنگِ حنین کا یہی نقشہ اس کے علاوہ دوسری جگہ صفحۂ قرآن پر کھینچا گیا ہے۔ حالانکہ حنین کی جنگ فتحِ مکہ کے بعد نبیؐ کی آخری جنگوں میں سے ہے لیکن اس قسم کے لوگوں کا جو آغاز تھا وہی انجام ہوا اور جیسے شروع میں تھے ویسے ہی آخر تک رہے۔

ان آیتوں میں ہمارے موصوف مخاطب کو کہیں بھی بچ

مذمت، منقصت نظر نہیں آتی بلکہ ہر جگہ مکارم و محاسن ہی
نظر آرہے ہیں۔ اگر ان آیات میں مکارم و محاسن کا دریا ٹھاٹھیں
مار رہا ہے تو شاید ان کے نزدیک مذمت اور انتہائی مذمت
اس آیت میں ہوگی۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ
فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔
"اللہ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو پرا باندھ کر راہِ خدا
میں قتال کرتے ہیں (ایسے ثابت قدم) گویا کہ وہ سیسہ
پلائی ہوئی دیوار ہیں۔" یا پھر ہمارے مخاطب کو مذمت اس
آیت میں نظر آتی ہوگی۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِذَا کَانُوْا مَعَہٗ عَلٰی
امرٍ جامعٍ لم یذھبوا حتّٰی یستاذنوہ "مومنین
تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور رسولؐ پر ایمان لائے اور وہ
جب کبھی بھی ایسے کام پر رسولؐ کے ساتھ ہوئے جہاں ان
کو جمع رہنا چاہیے تو وہ رسولؐ سے اذن لیے بغیر ہرگز نہیں گئے۔"
معاصر عزیز آپ بار بار قرآن کریم کی تکذیب کرتے

ہوئے ان جانے والوں کی غلطی کو کبھی سہو کہہ رہے ہیں۔ کبھی
بشریت کا دخل بتا رہے ہیں کبھی ارادہ سے مبرّا غیر ارادی
طور پر غلطی کا ہو جانا دکھا رہے ہیں کبھی یہ کہ انھوں نے سمجھ
لیا کہ فتح ہو چکنے کے بعد ہماری ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی، کبھی یہ کہ
جو کچھ ہوا سہواً ہو گیا۔ دیکھیے تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر صا۶۱۔
کتنے افسوس کی بات ہے کہ قرآنِ کریم تو صاف کہہ
رہا ہو کہ جنگِ اُحد کے موقع پر بر گھاٹی کے چھوڑ دینے
والوں کا عمل بالارادہ تھا اور جو کچھ یہ لوگ آئندہ کریں گے
بالارادہ ہی کریں گے لیکن ہمارے مخاطب عزیز اللہ تم سے
زیادہ عالم و دانا بن کر فرماتے ہیں کہ جو کچھ ہوا سہواً ہو گیا۔
آیتِ قرآنی میں تو خود لفظ ارادہ موجود ہے۔ منکم من
یرید الدنیا ومنکم من یرید الاٰخرۃ۔ کیا یرید
کا مصدر ارادہ نہیں ہے؟ جو لوگ گھاٹی سے نیچے اتر آئے
وہ بھی بالارادہ اترے اور جو کھڑے رہے وہ بھی بالارادہ
ہی اپنی جگہ قائم رہے۔ ارادہ کے ساتھ جو عمل ہوگا اس

میں سہو کیسا؟ اور سہواً جو کام ہوگا اس میں ارادہ کیسا؟
اسی طرح جو نیچے والے مع ان اوپر والوں کے جب میدان
چھوڑتے ہیں تو ارادةً ہی چھوڑتے ہیں سہو کا کوئی سوال ہی
نہیں۔ رسولؐ ان کو پکار رہے ہیں۔ یہ لوگ رسولؐ کی آواز
اور پکار کو سن رہے ہیں۔ پھر یہ کیسا سہو ہے جو رسولؐ
کی پکار سے بھی زائل نہیں ہوتا۔ ہمارے مخاطب کا یہ جملہ
بھی حرفِ غلط ہے کہ ان لوگوں نے سمجھا کہ فتح ہو چکنے پر ہماری
ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ یہ بات کہ ڈیوٹی ختم ہو چکی انھوں نے کیوں
نہیں سمجھی جنھوں نے وہیں مستقیم رہ کر اپنی جانیں دے دیں اس
کے علاوہ یہ ہے کہ یہ اکثریت کا سمجھ لینا کہ ہماری ڈیوٹی ختم
ہو گئی۔ اس وقت ممکن تھا کہ ڈیوٹی لگانے والے پیغمبرؐ نے
اس امر کی صراحت نہ کی ہو کہ ڈیوٹی کب تک رہے گی۔
نبیؐ نے ڈیوٹی تو لگا دی مگر کب تک یہ کچھ کہا ہی نہیں اگر
ایسا مانا جائے تو سارا الزام نبیؐ پر آتا ہے کہ جو مصیبت
نبیؐ اور مسلمانوں پر آئی وہ تمام نبیؐ کے گو مگو مبہم اور

ناقص و نا تمام حکم دینے کی بنا پر آئی۔ اس صورت میں
اللہ کا عتاب معاذ اللہ نبیؐ پر ہونا چاہیے نہ کہ ان پر
جن کو کوئی واضح حکم ملا ہی نہ تھا۔ پھر اگر یہ مرحلہ آ بھی گیا
تھا کہ باہم یہ بات زیر بحث تھی کہ ڈیوٹی ختم ہو چکی یا نہیں
تو ایک دو آدمی نیچے اتر کر ڈیوٹی لگانے والے پیغمبرؐ سے
آکر دریافت کر سکتا تھا کہ ہماری ڈیوٹی باقی ہے یا ختم ہو
چکی اگر یہ بھی نہ کیا تو یہ لوگ نیچے اتر کر اسی جانب تو آئے
جہاں نبیؐ موجود تھے اگر یہ لوگ نبیؐ کو اپنی صورت دکھا کر
عرض کر دیتے کہ ہم لوگ یہ سمجھ کر چلے آئے کہ اب ہماری
ڈیوٹی ختم ہو چکی اور کچھ لوگ یہ سمجھ کر وہیں رہ گئے کہ
ڈیوٹی ہماری بدستور باقی ہے تو آنحضورؐ ضرور کچھ فرماتے
یا یہ فرماتے کہ تم نے درست سمجھا ان کو بھی بلا لو یا یہ فرماتے
کہ تم نے غلط سمجھا جاؤ اپنی جگہ جاؤ مگر یہ کچھ بھی نہیں میرے
عزیز اگر انھوں نے یہ سمجھا ہوتا کہ ڈیوٹی ختم ہو چکی تو قرآن
ان کو مرید دنیا کیوں کہتا کیونکہ کفار کا چھوڑا ہوا مال اٹھانا

حبِ دنیا نہیں ہے بلکہ وہ اللہ کا دیا ہوا مسلمانوں کا حق
ہے اپنے حق کو لینا دنیا طلبی نہیں ہے - دین کو چھوڑ کر اللہ
اور رسولؐ کے حکم کے خلاف مالِ دنیا پر گرنا - اگر اوپر
سے نیچے آنے والوں کا اور نیچے سے اوپر جانے والوں کا
یہ عمل سہواً ہوتا تو اس کو نافرمانی اور عصیاں نہ کہا جاتا
کیونکہ سہوی عمل میں گناہ نہیں ہوتا - روزہ میں اگر کوئی شخص
بھول کر کچھ کھالے تو وہ گنہگار نہیں ہے - پھر یہاں بھول
کس بات کی تھی - کیا رسولؐ کا رسولؐ ہونا بھول گئے تھے
یا اپنا مسلمان ہونا بھول گئے تھے - یا حکمِ جہاد کو بھول
گئے تھے یا بھولے سے یہ سمجھ لیا تھا کہ جہاں ہم ہیں یہ
میدانِ جہاد نہیں ہے - ہم اس وقت کہیں اور ہیں لہٰذا
ہم ادھر دوڑے ہوئے جارہے ہیں جہاں لڑائی ہو رہی ہے
یا بھولے سے یہ سمجھ لیا تھا کہ رسولؐ خود پہاڑ پر ہیں ہم کو
ان کے ساتھ ہونا چاہیے آخر بھولے کس بات کو تھے
جو یہ کہا جائے کہ جو کچھ ہوا سہواً ہوا - جانے والے تو ارادۃً

قرآن (منکم من یرید الدنیا) ارادۃً گئے
تھے - آپ ان کی حمایت کہیں سہواً تو نہیں کر رہے ہیں؛
لیکن نہیں آپ بھی قرآن کی مخالفت اور ان جانے والوں
کی موافقت اسی طرح ارادۃً کر رہے ہیں جس طرح وہاں
ارادی فعل تھا - ہمارے مخاطب نے ایک جگہ یہ
دکھانا چاہا ہے کہ ان جانے والوں میں کوئی ہونے
والا خلیفہ نہ تھا چنانچہ فرماتے ہیں" - جنھیں آیت ۲۴/۵۵
کے مطابق خلافتِ ارضی عطا ہوئی، اُحد کے امتحان
میں فرسٹ ڈویژن اور اعلیٰ نمبروں سے پاس ہونے
والے وہی تھے" میں اس بحث سے بالکل بے تعلق
ہوں کہ یہ جانے والے کون تھے اور کون نہ تھے لیکن
جب کہ میرے مخاطب عزیز کو خلفاء کے بارے میں
پورا اطمینان ہے کہ وہ نہ تھے تو پھر ان جانے والوں
کی یہ حمایت کہ اس کی خاطر اللہ رسولؐ اور قرآن سب
کی مخالفت گوارا کی جارہی ہے - یہ کس غرض کے لیے ہے

اور جب خلافتِ ارضی عطا ہونے کا وعدہ اُحد کے امتحان میں
فرسٹ ڈویژن اور اعلیٰ نمبروں سے پاس ہونے والوں کے
لیے تھا تو حضرت علیؑ کا سب کے بعد خلیفہ ہونا یہ بتاتا ہے
کہ اس امتحان میں ان کے نمبر سب سے کم تھے۔ اور یہ ہے
ایک مسلم حقیقت کہ وہ رہے انتہائی ثابت قدم۔ رسولؐ
سے وابستہ اور رسولؐ کے جان نثار تو کیا یہ امتحان ثابت قدمی
کی بجائے تیز قدمی کا تھا جو اللہ نے علی مرتضیٰؑ کو انتہائی سست
قدم ہونے اور زمین جنگ کو چپٹے رہنے کی وجہ سے ہر ایک
کا محکوم رکھ کر بالکل آخر میں خلیفہ بنایا۔ بہرحال آپ کا یہ
فرمانا کہ گھاٹی سے نیچے آنے والوں کا اُتر آنا اور نیچے والوں
کا پہاڑ پر چڑھ جانا ارادہ کے بغیر سہواً تھا۔ یہ کسی طرح
بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اگر یہ بات کو نباہنا ہی تھا تو
آپ نے یہ کیوں نہ فرما دیا کہ اوپر والوں کے پیر کسی چکنے
پتھر سے پھسل گئے تھے اور وہ غریب بلا ارادہ پھسلتے ہوئے
نیچے آگئے تھے اور اسکی تائید میں قرآن مجید کی یہ آیت فٹ

کردیتے اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ - ان کو تو شیطان
نے پھسلا دیا تھا" تو قرآن سے یہ بات بنتی یا نہ بنتی لیکن
آپ کے لفظ سہوا اور بلا ارادہ کے کچھ معنیٰ تو ہوتے۔ کیونکہ
اوپر سے نیچے پھسل کر آجانا ممکنات سے ہے البتہ نیچے
والوں کا اوپر چلا جانا یہ ایسی قیامت ہے کہ یہ بات
کون مانے گا کہ یہ لوگ پھسل کر نیچے سے اوپر جا پہنچے۔
ہمارے مخاطب کا یہ فرمانا کہ جماعتِ صحابہ کے افراد نہ ایک
جیسے تھے اور نہ بشری تقاضوں کے مطابق سہو و خطا سے
مبرا تھے۔ یہ تو بالکل صحیح ہے کہ جماعت میں سب ایک
جیسے نہ تھے۔ ان میں جتنے سچے مومن بھی تھے اور کہنے کے
مسلمان بھی تھے۔ اس اختلاط کا امتیاز امتحان کے وقت
ہی ظاہر ہوتا ہے۔ جیسے کہ آیت نے طے کر دیا کہ مومن
صرف وہ ہیں جو امر جامع کے وقت اذن کے بغیر رسولؐ
سے ہرگز جدا نہ ہوئے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ سہو و خطا سے
مبرا نہ تھے لیکن آپ کے نزدیک تو منزّہ عن الخطا محض

ذاتِ باری ہے، نبیؐ تک منزّہ عن الخطا نہیں، تو پھر تو نبیؐ تک میدان چھوڑ کر ادھر اُدھر (معاذ اللہ) جا سکتے ہیں۔ آپ نے ان جانے والوں کے اپنے جملہ سے "نہ بشری تقاضوں کے مطابق سہو و خطا سے مبّرا تھے،، بالکل بری کر دیا۔ کیونکہ جب سہو و خطا بشری تقاضوں کے مطابق ہوئی تو ان کی خطا خطا نہ رہی۔ اب تو خطا اس کی ہوئی جس نے بشر کو خطا کے مطابق بشری تقاضے دیے۔ اب بشر نہ بشری تقاضوں کو چھوڑ سکتا ہے نہ خطا سے بچ سکتا ہے۔ اللہ نے خطا پر مجبور بھی کر دیا اور خطا پر مستوجب عذاب بھی بنا دیا۔ اس سے زیادہ اللہ کا معاذ اللہ اور کیا ظلم ہوگا۔ پھر نبیؐ اور وہ مومن جو ثابت قدم رہے وہ سہو و خطا سے مبّرا ہوئے اور بشری تقاضوں سے پاک ہوئے۔ تو کیا صرف وہ چلے جانے والے بشر تھے اور یہ ثابت قدم رہنے والے نہ بشر تھے نہ ان میں بشری تقاضے تھے؟ ہمارے مخاطب کو ان جانے والوں میں ان کے جاتے وقت بھی

مکارم و محاسن نظر آ رہے ہیں۔ شاید انھوں نے دیکھا ہو کہ یہ لوگ میدان سے جاتے ہوئے بھی جگہ جگہ سجدۂ شکر کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ کلمۂ الحمد للہ ان کی زبان پر تھا وہ نبیؐ کی آواز سن کر نبیؐ کی پکار پر ہر دفعہ نبیؐ پر درود پڑھتے تھے اور نبیؐ کی طرف رُخ کیے بغیر نبیؐ کو سو سو سلام کر کے جا رہے تھے۔

عفو کے معنیٰ درگزر کرنے کے ہیں بخشش آخرت اور نجات کے نہیں ہیں

گنہگار کے لیے عفو اور مغفرت یہ دو لفظ بولے جاتے ہیں۔ نا واقف حضرات ان دونوں لفظوں کا مفہوم ایک سمجھ لیتے ہیں۔ انھوں نے جہاں لفظِ عَفو دیکھا سمجھ لیا کہ بس بخشش ہو گئی۔ حالانکہ عفو اور چیز ہے مغفرت اور چیز ہے۔ اس ہی غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہے کہ جنگِ اُحد سے راہِ فرار اختیار کرنے والوں کے لیے "قرآنِ کریم میں لفظ عَفو دیکھ کر سمجھ لیا کہ اللہ نے ان کے گناہ کو یکسر معاف کر دیا اور

بخش دیا جس کی آخرت میں اب کوئی باز پرس نہ ہو گی چنانچہ
میدانِ جنگ میں نہ ٹھہرنے والوں کی حمایت میں اس لفظ
عفو کو پیش کیا جا رہا ہے۔ ہمارے مخاطب بھی یہاں چلے
ہوئے راستہ پر چل رہے ہیں حالانکہ ان کی قابلیت کا
اقتضاء تھا کہ وہ عفو اور مغفرت کے لفظ کو سمجھیں اور
جو فرق ان دونوں لفظوں میں ہے اس امتیاز کو محسوس
کریں اور دوسرے ناواقف حضرات کو بتائیں لیکن "اے
بسا آرزو کہ خاک شدہ" جنگ سے جلتے والوں کی
شدید حمایت میں وہ حقیقت پوشی سے کام لینے پر
مجبور ہیں۔ اس لیے قرآن کریم کی صاف اور تیز روشنی
میں ان دونوں لفظوں کا امتیاز ہم کو دکھانا پڑ رہا ہے۔
عفو کہتے ہیں درگزر کرنے کو، چشم پوشی اور طرح دینے کو
گناہ کو یکسر بخش دینے کا یہاں کوئی ذکر ہی نہیں۔ لفظ
مغفرت کے معنی ہیں بخش دینے کے۔ عفو ایسی چیز ہے
کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ عام بندے بھی اپنے مخالف کو

عفو کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں لیکن کسی گناہ کا یکسر
بخش دینا کہ اب آخرت کا اس پر کوئی مواخذہ ہی نہ رہے
بندے تو بندے یہ کام نبیؐ کا بھی نہیں۔ چنانچہ فرمایا جاتا
ہے وَمَن یَّغْفِرُ الذُّنُوبَ اِلَّا اللہُ "گناہوں کو
اللہ کے سوا کون بخش سکتا ہے"۔ عفو و درگزر وہ ہے
جس کا تعلق دنیا سے ہے اور مغفرت وہ بخشنا ہے جس
کا تعلق آخرت سے ہے۔ خدا تعالیٰ نے کہیں بھی یہ
نہیں فرمایا کہ ان جنگ سے منحرف ہو جانے والوں کو
یعنی بھاگ جانے والوں کو ہم نے بخش دیا۔ صرف یہ فرمایا
ہے کہ ہم نے ان سے درگزر کیا، چشم پوشی کی طرح دی۔
اس کے بعد فرمایا کہ اللہ غفور اور حلیم بھی ہے۔ یہاں اللہ نے
محض اپنی صفتِ غفوری کو بیان فرمایا ہے۔ اس صفت
کو میدانِ جنگ سے ان چلے جانے والوں سے کوئی نسبت
نہیں دی اور یہ ہرگز نہیں کہا کہ اللہ ان کے لیے غفور اور
حلیم ہے۔ اس نے اپنے آپ کو غفور اور حلیم کہہ کر اس

طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم نے اس وقت صرف عفو اور درگزر
کیا ہے۔ بخشا کسی کو نہیں۔ لیکن ہم یہ یاد دلاتے ہیں کہ
ہم غفور (بخشنے والے بھی ہیں) جس کے معنی حقیقتاً یہ
ہیں کہ اس عفو کے بعد اگر یہ لوگ سب یا بعض اپنے کیے
ہوئے جرم سے بصدقِ دل تائب ہو جائیں اور آئندہ اس
قسم کے حرکات نہ کریں اور اپنے فرار کو قرار سے اور لغزش کو
ثباتِ قدم سے بدل دیں تو یہ عفو بھی مغفرت سے بدل
جائے گا۔ اور یہ جرم یکسر بخش دیا جائے گا کیونکہ اللہ غفور
اور حلیم ہے لیکن اگر انھوں نے آئندہ اپنی اصلاح نہ کی، جرم
سابق سے تائب نہ ہوئے اور جنگِ حنین تک یہ اپنے اسی
نقشہ کو دہراتے رہیں تو اس عفو کے بعد وہ مغفرت کے ہرگز
مستحق نہ ہوں گے۔ اسی لیے اس نے عفا اللہ عنہم کی طرح
غفر اللہ لہم نہیں فرمایا۔ بلکہ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ہم نے
صرف درگزر کیا ہے تم بھی ان سے درگزر کرو لیکن چونکہ
ہم نے ان کو بخشا نہیں ہے لہٰذا (دعا کرو کہ ہم انکو بخش

بھی دیں۔ اگر عفو کے معنی بخش دینے کے ہوتے تو جرم تو
بخشا گیا اب نبیؐ سے بخشش جرم کی دعا کے لیے اللہ کیوں
کہہ رہا ہے۔ یہاں یہ بھی سمجھ لیجیے کہ نبیؐ سے بخشش جرم کی دعا
کرانے کا مطلب کیا ہے: فقہ اسلام نے اس امر کو واضح کیا
ہے کہ کسی زندہ کافر کے لیے بھی اس مقصد سے دعا مغفرت
ہو سکتی ہے کہ وہ دیندار اور مشرف باسلام ہو کر لائق
مغفرت ہو جائے لیکن کسی بے دین کے مرنے کے بعد اس
کے لیے دعائے مغفرت کرنا حرام ہے۔ کیونکہ اب اس کے
دیندار اور مومن ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ اس معنی میں
حضرت ابراہیمؑ نے آزر کی زندگی میں اس کی مغفرت کی
یعنی دیندار ہو کر بخشے جانے کی دعا کی لیکن اس کے مرنے
کے بعد دعا کرنا چھوڑ دیا۔ اس ہی معنی میں ان مجرمین کے
جرم کی بخشش چاہنے کے لیے نبیؐ سے کہا جا رہا ہے کہ اے
نبیؐ تم اس امر کے خواہاں رہو کہ یہ لوگ کیے ہوئے جرم سے
تائب ہو کر آئندہ استقامت اختیار کریں جو ان کی مغفرت

کا سبب ہو جائے ورنہ ان کے لیے استغفار کرنے کا حکم
نبیؐ کو اس صورت میں تو نہیں کہ یہ لوگ آج کی طرح ہر آنے
والی کل میں اسی طرح دوڑتے بھاگتے بھی رہیں۔ آئندہ بھی یہ
لوگ تمہارا ساتھ نہ دیں، تمہاری پکار کو نہ سنیں، تم کو
نرغۂ کفار میں چھوڑ چھوڑ کر جاتے رہیں، مگر تم انکی بخشش
کے طلبگار رہو۔ بخشش کی صورت یہی ہے کہ درِ توبہ کھلا ہوا
ہے۔ اصلاحِ عمل کا موقع ہے۔ کافر اپنے کفر کو چھوڑ دے
اللہ غفور ہے۔ منافق اپنے نفاق کو چھوڑ دے اللہ غفور
ہے۔ مجرم اور گنہگار اپنے جرم کو چھوڑ دے اللہ غفور ہے
لیکن اگر نہ چھوڑے تو بھی اللہ غفور ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں!
پھر وہ شدید العقاب ہے۔ پھر اس کا عذاب شدید ہے۔ اس
صورت میں نہ پیغمبرؐ استغفار کر سکتے ہیں نہ پیغمبرؐ کا استغفار
کارآمد ہو سکتا ہے جیسا کہ سورۂ منافقون میں فرمایا گیا ہے۔
سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ اسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ
لَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔ "ان کے لیے برابر ہے، اے نبیؐ!

تم ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو، اللہ ان کو ہرگز نہ
بخشے گا۔ دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے کہ اے نبیؐ تم ان کے
لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کرو مگر بے سود ہے۔ کیونکہ وہ
اپنے جرم کو چھوڑ نہیں رہے ہیں۔ جب تک جرم نہ چھوڑیں
گے ہم تمہاری دعائے مغفرت کو بھی سننے والے نہیں۔ نبیؐ
سے یہ خطاب صرف ان کی مغفرت نہ ہونے کا حتمی اور
یقینی دکھانے کے لیے ہے۔ ورنہ نبی سے یہ ممکن ہی نہیں
کہ وہ کوئی بھی نامناسب دعا کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر
مجرم ارتکابِ جرم کے بعد اس دنیوی سزا کا بھی مستوجب
ہو جاتا ہے انتقاماً، تادیباً، عبرتاً دی جاتی ہے۔ یہ
دنیوی سزا حقیقی سزا نہیں ہوتی، اور اس سزائے آخرت
کی بھی مستوجب ہو جاتی ہے جو عمل کا واقعی بدلہ ہے۔
وہاں کی سزا انتقاماً، تادیباً اور عبرتاً نہیں ہوتی۔ لہٰذا
دنیا کی سزا چونکہ انتقاماً ہے اگر خاص صورتِ حالات
میں یہ سزا منافیِ حکمت ہے اور درگزر کرنا مطابقِ حکمت ہے۔

تو سزا کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ کیونکہ واقعی سزا کا دن آرہا ہے۔ یہ دنیوی سزا تھی۔ انتظام کو درست کرنے کے لیے، لیکن صورتِ حال یہ ہو گئی کہ اب سزا دینے میں شیرازۂ انتظام درہم برہم ہوتا ہے اس لیے غرض سزا جو تھی وہ مفقود ہو گئی۔ مثلاً اتنے زیادہ لوگوں نے اور اتنی کثرت نے وہ جرم کیا ہے کہ اب ان سب کو سزا دینے میں اسلام کی ہوا اکھڑتی ہے۔ دین کو ضعف اور کفر کو طاقت پہنچتی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ لڑائی سے منہ موڑ کر چلے جانے والی سزا موت سے کم نہیں ہے تو یہ لوگ جس موت سے بچنے کے لیے میدان سے چلے گئے تھے کیا اب آسانی سے اسی موت کے سامنے سر جھکا دیں گے۔ موت ہی سے بچنے کے لیے تو نبیؐ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اب یہ موت کی سزا دیکھ کر نبیؐ کے پاس لگے رہیں گے اور اب نبیؐ کو نہ چھوڑ جائیں گے اور نبیؐ سے جُدا نہ ہو جائیں گے۔ اس وقت کفر اور اسلام کا تصادم ہے۔ مقابلہ پر کفار کا گروہ

ہے اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ جس وقت دو پارٹی مدِ مقابل ہوں اگر کسی ایک پارٹی کے آدمی اپنی پارٹی سے کٹتے ہیں یعنی اپنی پارٹی سے جدا ہو کر نکل جاتے ہیں تو وہ اپنی طاقت کو قائم رکھنے کے لیے مقابلہ کی پارٹی اور مقابلہ کی طاقت میں شامل ہو جاتے ہیں لہٰذا اتنی کثرت کو سزا کی بنا پر مسلمانوں کے گروہ سے نکال کر کفار کی طاقت میں شامل کر دینا کوئی حکمتِ عملی نہیں ہے۔ کم سے کم اس وقت اتنا تو ہے کہ یہ لوگ اگر اسلام کا بازوئے شمشیر زن نہیں بنتے، اگر مردانہ وار کفار سے جہاد نہیں کرتے تو یہی غنیمت ہے کہ کفار کے ساتھ رہ کر دینداروں پر تو اپنی تلواریں نہیں برسا رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنی طاقت سے دینداروں کی طاقت نہیں بڑھا رہے ہیں تو یہاں سے الگ ہو کر دشمن میں شامل ہو کر دینداروں کے مقابلہ میں تو نہیں آرہے ہیں۔ یہ سب کچھ میں از روئے قرآن کہہ رہا ہوں کہ نبیؐ کو جب ان لوگوں سے درگزر کرنے کے لیے

کہا گیا تو اس سے پہلے قرآن نے یہ تمام نقشہ کھینچ کر
رکھ دیا اور یہ واضح کر دیا کہ عفو کے حکم کی غرض و غایت
کیا ہے۔ ارشادِ قرآنی ہے ان ہی احد کے میدان سے
ادھر ادھر چلے جانے والوں کے بارہ میں۔

فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظًا
غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنھم
واستغفر لھم وشاورھم فی الامر۔

"اے نبیؐ! تم اللہ کی رحمت سے ان لوگوں کے
لیے نرم رہے ہو اور اگر تم سخت گیر اور سخت دل ہوتے
تو یہ لوگ کبھی کے تمھارے پاس سے ادھر ادھر منتشر
ہو جاتے پس تم ان سے درگزر کرو اور ان کے لیے
بخشش چاہو اور جو کام مشورہ کے لائق ہیں۔ ان
کاموں میں ان سے بھی مشورہ کر لیا کرو۔"

کیا اس پوری عبارت سے ظاہر نہیں ہو رہا ہے
کہ ان لوگوں سے عفو و درگزر کا حکم اس لیے ہو رہا ہے

کہ ان کا سختی سے احتساب ہوگا تو یہ لوگ تمھارے
پاس سے ہٹ کر کسی اور طرف لگ جائیں گے۔ ان کا
اب تک بھی تمھارے گرد رہنا محض اس وجہ سے
ہے کہ تم نے ہمیشہ ان سے نرمی کا برتاؤ کیا ہے۔ کبھی
سخت گیری اختیار نہیں کی ورنہ اگر تم سختی سے ان کے
کردار کا احتساب کرتے تو یہ کبھی کا تم کو چھوڑ دیتے لہٰذا
جس طرح تم نے اب تک ان کے طرزِ عمل سے درگزر
کیا ہے۔ اب بھی اسی طرح درگزر کرو جس طرح تم نے
اب تک ان کو شریکِ مشورہ رکھا ہے اب بھی شریکِ
مشورہ رکھو تاکہ یہ لوگ تمھاری سختی اور بے رخی دیکھ کر
تم کو چھوڑ چھاڑ کر نہ چلے جائیں۔ مقصدِ ارشادِ الٰہی صاف
ہے کہ ان لوگوں کا تمھارے پاس سے ہٹ کر منتشر ہو جانا
ایک تو یہ کہ ان کے اصلاح پذیر ہونے کا امکان ختم ہو
جائے گا دوسرے یہ کہ یہ لوگ تمھارے گروہ سے نکل کر
مخالف گروہ کفار کا دست و بازو بنیں گے لہٰذا یہ کبھی

پہلو پر بھی مفید نہ ہوگا۔ یہ ہے اس عفو و درگزر کی حقیقت جس کو بخشش جرم کا پروانہ سمجھا جا رہا ہے۔ میں اپنے محترم مخاطب سے سوال کرتا ہوں کہ یہ میدانِ جنگ کو چھوڑ کر چلے جانے والے تو پھر بھی کلمہ گو تھے کیا لفظ عفو کا استعمال قرآنِ کریم نے ان یہود و نصاریٰ اور کفار کے لیے نہیں کیا جو نبیؐ آخر کی تکذیب کر رہے تھے اور نبیؐ کے انتہائی دشمن تھے کیا اللہ تعالیٰ ان کفار کے لیے لفظِ عفو کہہ کر ان کفار کو عذاب آخرت سے بری کر رہا ہے اور ان کے کافر رہتے ہوئے بھی ان کو بخش رہا ہے۔ میں قرآنِ مجید سے چار آیات پیش کرتا ہوں جن میں یہود و نصاریٰ وغیرہ کفار سے عفو اور درگزر کرنے کا ذکر ہے۔ فرمایا جاتا ہے:۔

۱۔ ودّ کثیرٌ من اھل الکتاب۔ الخ

اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ کا ذکر کرتے ہوئے ارشادِ باری ہے فاعفوا واصفحوا حتّٰی یاتی اللہ بامرہٖ "اے مسلمانو تم ان اہلِ کتاب کو عفو کرو اور درگزر کرو

تا آنکہ اللہ اپنا حکم لائے۔" کیا یہاں عفو اور درگزر سے مراد ان کے جرم و گناہ کا بخش دینا ہے؟ نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ تم ان سے جب تک ہمارا حکم آئے کوئی انتقام نہ لو اور جواباً کوئی اقدام نہ کرو۔

۲۔ قد جاءکم رسولنا یبیّن لکم کثیرا مما کنتم تخفون من الکتب ویعفوا عن کثیر (المائدہ رکوع ۳) "اے یہودیو تمہارے پاس ہمارا رسولؐ آ گیا ہے جو تورات میں سے تمہاری بہت سی چھپائی ہوئی باتوں کو ظاہر کرتا ہے اور تمہاری بہت سی باتوں کو عفو کر دیتا ہے کیا یہاں عفو سے مراد یہودیوں کے بہت سے گناہوں کو بخش دیتا ہے کہ اب گناہوں کی آخرت میں ان سے باز پرس نہ ہوگی؟ نہیں! عفو سے مراد محض درگزر، چشم پوشی ہے اور جوابی کاروائی کا نہ کرنا ہے۔ آخرت سے اس عفو کا کوئی تعلق نہیں۔

۳۔ ان ہی یہودیوں کے بارہ میں رسولؐ سے فرمایا جاتا ہے۔ ولاتزال تطّلع علیٰ خائنۃٍ منھم الّا قلیلاً منھم فاعف عنھم واصفح ان اللّٰہ یحبّ المحسنین (المائدہ رکوع ۳)

"اے رسولؐ تم معدودے چند کے سوا یہودیوں کی اکثریت کی طرف سے ہمیشہ خیانت دیکھتے رہو گے۔ پس تم ان سے عفو کرو اور چشم پوشی کرو۔ اللہ نیک لوگوں کو (اپنے دشمن سے درگزر کرنے والوں کو) محبوب رکھتا ہے۔ کیا یہاں عفو سے مراد یہودیوں کے جرم و گناہ کو بخش دینے سے ہے؟ نہیں، بلکہ محض درگزر اور چشم پوشی اور جواب کے لیے نہ کھڑا ہونا ہے۔

۴۔ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِہٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِکَ ۝

"اے یہودیو تم نے پھر گوسالہ بنا لیا جبکہ تم ظالم تھے

پھر ہم نے تم سے عفو کیا"۔ اگر عفو سے مراد یہاں یہ ہوتی کہ ان کو عذاب آخرت سے بری کر دیا اور بخش دیا تو پھر ان ہی لوگوں کے لیے اسی قرآن میں عذاب و عقاب کی کیوں خبر دی جاتی۔ یہاں بھی عفو سے مراد وقتی سزا کو برطرف کر کے مہلت دینا ہے۔

لفظ عفو کے ساتھ جب تک آخرت کی تصریح نہ ہو اس سے عفوِ دنیا ہی مراد ہوگا

لفظِ عفو کے لیے ہم دکھا چکے ہیں کہ اس سے مراد دنیوی سزا سے درگزر کرنا ہوتا ہے۔ آخرت کی درگزر کے لیے اور وہاں کی سزا کے ختم کر دینے کے لیے لفظ مغفرت اس لیے اگر آخرت کی رستگاری مراد ہوتی ہے تو یا تو لفظ عفو کے ساتھ لفظ مغفرت الگ سے آتا ہے یا لفظِ عفو کو آخرت تک موثر بنانے کے لیے لفظ آخرت کی تصریح کر

دی جاتی ہے جیسے کہ آخر سورۃ البقرۃ میں یہ دعا ہے :-
وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا
فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ "اے معبود ہم
سے درگزر کر اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحمت نازل فرما تو
ہی ہمارا سرپرست ہے۔ پس تو کفار کے مقابلہ میں ہماری
مدد کر۔" دعاء عفو کے بعد دعائے مغفرت الگ ہے یعنی
ہم کو دنیا میں بھی سزا سے محفوظ رکھ اور آخرت میں بھی۔ اسی
طرح قرآن مجید میں جناب خلیل اللہ کی دعا کا ذکر ہے جس
میں واعف عنا کے بعد آیا ہے فی الدنیا والآخرۃ۔ اے
معبود ہم سے عفو کر دنیا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ لفظِ
آخرت کی تصریح اسی لیے کی گئی ہے کہ یہ عفو محض دنیا ہی
میں محدود نہ رہے کیونکہ لفظ عفو کے بعد اگر لفظ آخرت
یا لفظ مغفرت نہ ہو تو اس سے مراد اخروی درگزر ہرگز نہ
ہوگا بلکہ وقتی اور دنیاوی درگزر ہوگا۔ ام المومنین پر تہمت
لگانے والے کا نام مسطح بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ

وہ اہلِ بدر سے بھی تھے اور ام المومنین اور ان کے والد
بزرگوار سے قرابت قریبہ بھی رکھتے تھے۔ مسطح بدری مذکور
کے اس جرم تہمت پر ان کے ان اقرباء نے یہ طے کیا
کہ اب آئندہ ہم مسطح کی مالی مدد نہ کریں گے۔ اس پر یہ آیت
آئی۔ ولا یاتل اولوا الفضل منکم والسعۃ
ان یؤتوا اولی القربیٰ۔ مستطیع لوگ یہ عہد نہ کریں
کہ وہ اپنے اقرباء کو (مالی مدد) نہ دیں گے۔ اس کے بعد
فرمایا جاتا ہے فالیعفوا ولیصفحوا۔ ان کو عفو اور
درگزر کرنا چاہیے۔ یہاں بھی عفو سے مراد ہے انتقام نہ
لینا، یہ نہیں کہ تم اس کے گناہ کو بخش دو۔

زمانۂ نزول وحی میں لوگ اپنے متوفی آباء و اجداد
کے بارہ میں نبیؐ سے سوال کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ ان کا کیا
حشر ہوگا اور ان پر کیا گزری۔ اس پر آیت نازل ہوئی۔
یا ایھا الذین امنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان
تبد لکم تسؤکم۔ ایمان لانے والو ان چیزوں کے

بارہ میں سوال مت کرو۔ جن کا اظہار تم کو ناگوار گزرے گا
اس کے بعد فرمایا جاتا ہے۔ عفی اللہ عنہا۔ اللہ نے
ان چیزوں کے بارہ میں تمہارے سوال کرنے سے درگزر کیا
یعنی تم کو ناگوار گزرنے والی خبر نہ بتائی۔ یہاں بھی عفو
سے مراد محض درگزر اور چشم پوشی ہے۔ کسی جرم کی
بخشش مراد نہیں ہے۔ ہمارے مخاطب عزیز کا ایک
جملہ اور سنیے۔ فرماتے ہیں :-

"جنھیں آپ بھگوڑے کہتے ہیں قرآن انھیں
حضورؐ کی مجلسِ شوریٰ کا رکن بتاتا ہے۔"

— جناب والا بھگوڑے یا بھگوڑا میں کہتا ہوں یا
قرآن نے کہا ہے۔ میں نے تو موجودہ ہیئت سے کہیں یہ
لفظ استعمال ہی نہیں کیا۔ البتہ آیتِ قرآنی کے ترجمہ
میں بھاگنا، منہ موڑنا، چلا جانا ضرور کہا ہے۔ اگر آپ
کا عتاب اس ترجمہ پر ہے تو ان لفظوں کا مناسب اور
صحیح ترجمہ آپ ہی بتا دیتے۔ ولیتخمد برین کا ترجمہ

تم پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے نہیں تو اور کیا ہے۔ انّ
الذین تولوا منکم کا ترجمہ یقیناً جو لوگ تم میں
سے بھاگ گئے، نہیں تو اور کیا ہے کیا میں اس کے ترجمہ
میں تشریف لے گئے، کہتا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ
آپ کو کلامِ ربانی پر اعتراض ہے۔ جو بات قرآن نے
کہی ہے اس کا غصہ مجھ پر۔ میری کیا مجال تھی کہ قرآنِ کریم
کے کہے بغیر میں اپنے دل سے کہتا اللہ ہر مسلمان کو اس
سے محفوظ رکھے کہ وہ منشارِ قرآنی کے خلاف کہے اور
جو ایسا کرتے ہیں اللہ ان کو راہ راست پر لائے۔ اگر بھاگ
جانا، منہ موڑنا، چلا جانا، ہمت ہار دینا، حکم نبیؐ پر تنازعہ
کرنا، نبیؐ کے حکم کی نافرمانی کرنا، میدان چھوڑ کر پہاڑ پر چڑھ جانا،
رسولؐ کی پکار کو نہ سننا، طلبگارِ دنیا ہونا یہ لفظ آپ کو ناگوار
ہوتے ہیں تو جن قرآن کے یہ الفاظ ہیں آپ نے اس قرآن کی
تبلیغ کا علم کیوں سنبھالا ہے۔ بلاغ القرآن کا کام کیوں اختیار
کیا ہے۔ یہ لفظ میرے بجائے قرآن سے کہیے کہ جن کو بھگوڑا

کہہ رہا ہے۔ ان ہی کو تو حضور کی مجلسِ شوریٰ کا رکن بنا تا ہے۔ یہ معمہ ہے کیا؟ تو قرآن جواب دیتا آپ کہ یہ تم اپنے خالق کے ہم نوا ہوتے نہیں، اُلٹا یہ چاہتے ہو کہ خالق تمہارا ہم نوا ہو جائے۔ میرے خدا نے وہی کہا جو دیکھا اور ایک بار نہیں اُحد سے حنین تک دیکھتا رہا ان کا مجلسِ شوریٰ کا رکن ہونا تم جو بھی بڑے سے بڑا لفظ چاہو ان کے لیے کہہ دو لیکن میں نے تو کہا یہ ہے کہ اے رسولؐ تم ہمیشہ ان لوگوں کی طرف سے سب کچھ دیکھتے رہنے کے باوجود نرم برتاؤ کرتے رہے ہو تم نے سختی سے کبھی ان کا احتساب نہیں کیا۔ اس ہی کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ تمہارے پاس جنگ میں نہیں رہے تو جنگ کے علاوہ اور موقع پر تو رہے۔ اگر تم ان پر سختی کرتے تو یہ کبھی کے چلے گئے ہوتے۔ لہذا اب بھی بدستور ان سے درگزر کرو اور ان کی بخشش چاہو۔ اور ان سے مشورہ کر لیا کرو تاکہ یہ لوگ تمہاری بے رخی دیکھ کر تم کو چھوڑ چھاڑ کر نہ چلے جائیں

ہیں نے نبیؐ سے مشاورھم فی الامر کوئی ان لوگوں کے اعزاز واحترام میں نہیں کہا بلکہ تالیفِ قلب کے پہلو سے کہا ہے۔ ہیں نے نبیؐ سے ان سے مشورہ کرتے رہنے کو کہا ہے۔ یہ تو نہیں کہا ان کے مشورہ پر عمل بھی کرو۔ اور وہی کرو جو وہ کہیں۔ مخالف کے مشورہ کی مخالفت خود صحیح راستہ سامنے لے آتی ہے۔ مشورہ کے دو پہلو الگ الگ ہیں مشورہ کرنے والا ایک وہ شخص ہے جس کا علم و فہم کم ہو جس کی نظر میں وسعت نہ ہو وہ مشورہ کیا کرتا ہے دوسروں کے علم و فہم اور وسعتِ نظر سے فائدہ اٹھانے کے لیے اور دوسروں کا مشورہ ماننے کے لیے۔ ایک مشورہ کرنے والا وہ ہے جس کا علم و فہم جس کی وسعتِ نظر جس کی حکمت و قابلیت سب پر فائق ہو وہ دوسروں سے مشورہ اصولِ حکمت کی بنا پر ضرور کر سکتا ہے لیکن اس کا مشورہ دوسروں کی بات ماننے کے لیے نہ ہوگا بلکہ دوسروں سے اپنی بات منوانے کے لیے ہوگا۔ لہذا نبیؐ حکیم کا مشورہ

کرنا جس کا مشیر خود خدا نے حکیم ہو دوسروں کی بات ماننے کے لیے نہ ہوگا بلکہ اپنی بات منوانے کے لیے ہوگا

مخاطبِ محترم کا شیعہ تلقین پر جس میں روح میت سے خطاب ہوتا ہے، اعتراض

فرماتے ہیں :-

"شیعہ مذہب کی نماز میں ایک تلقین درج ہے جو ہر غیر شہید میت تک کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر اور میت کو اس طرح مخاطب کر کے پڑھی جاتی ہے کہ لے فلاں ابن فلاں تیرے پاس دو فرشتے آئیں گے اور تجھ سے سوال کریں گے کہ تیرا رب کون ہے؟ نبی کون ہے! امام کون ہے؟ تو جواب دینا کہ میرا رب اللہ ہے، نبی محمدؐ ہیں اور امام علیؑ، حسنؑ، حسینؑ، زین العابدینؑ تا امام مہدی علیہم السلام۔ ہم پوچھتے ہیں کہ جب زید، بکر، امر، اچھے بُرے مرنے کے بعد سب زندہ ہیں تلقین سنتے ہیں اور فرشتوں کو جواب دیتے ہیں، جو نیک ہیں جنت کے میوے کھاتے ہیں تو برائے نوازش بتایا جائے کہ شہداء کی تخصیص کا کیا مطلب؟ کہ شہید زندہ ہیں شہید زندہ ہیں۔ یا للعجب"

جناب والا! ہم پہلے ہی یہ واضح کر چکے ہیں کہ بعد وفات زندہ ہونا اور بات ہے اور وفات پانے والے کی روح کا موجود ہونا اور بات ہے۔ روح ہر مومن و کافر کی رہتی ہے کیونکہ اسکو اچھا، برا بدلہ ملتا ہے۔ مگر تنہا روح کا موجود ہونا زندگی نہیں ہے کیونکہ مرنے والوں کی روح مکلّف نہیں رہی۔ اس پر ایمان و عمل کی ذمہ داری نہیں رہی اب نہ اس سے ایمان کا مطالبہ ہے نہ عمل کا اسکو جسے ماننا تھا مان چکا تھا اور جو کچھ اسکو کرنا تھا کر چکا ہم ہر مرنے والے کو خواہ وہ مومن ہی ہو زندہ نہیں سمجھتے۔ زندہ صرف وہ ہیں جن کی زندگی کی اللہ نے خبر دی ہے۔ اور جن کو حی لا یموت نے زندہ کیا ہے وہ عالم خبر رہتے ہیں، رزق پاتے ہیں جب

کہ عام مرنے والوں کے لئے یہ غلط ہے کہ وہ عالم برزخ
میں جنت کے پھل کھاتے ہیں۔ روح جبکہ مجرد اور بے جسم
ہو تو اس کے کھانے پینے کا سوال کیا۔ لیکن مرنے والے
کی روح ضرور موجود رہتی ہے جس سے سوال بھی ہوتا ہے
اور وہ جواب بھی دیتی ہے۔ آپ اپنے آپ کو کتنا ہی
بے روح کہیں لیکن سوال آپ سے بھی ہوگا۔ ہماری اس تحقیق
کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہمارے بارہ میں بہت سے
غلط افواہ پھیلاتے جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ شیعہ علیؑ کو
اللہ مانتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ یہ لوگ علیؑ کو نبی مانتے
ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ علیؑ کو نبیٔ آخر سے افضل مانتے
ہیں۔ یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جبریلؑ کو علیؑ کے پاس آنا تھا غلطی
سے آنحضورؐ کے پاس پہنچ گئے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ کعبہ کو نہیں مانتے
اس کا حج نہیں کرتے۔ یہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتے، یہ مسلمان
نہیں ہیں اور یہ بات تو عام ہے کہ یہ لوگ صحابہ کو نہیں مانتے
مگر کوئی اس پر غور نہیں کرتا کہ لفظ صحابہ کو وسعت دے

کر خود آپ نے ایسے لوگوں کو شامل کر لیا جن کو ماننا آسان نہیں
رہا۔ ابھی ابھی مسئلۂ جہاد پر مفصل بحث ہو چکی ہے، ہم ان
حضرات کو یقیناً مانتے ہیں جنھوں نے ہر میدان میں بنیانٌ
مرصوص بن کر جہاد کیا۔ جنھوں نے کبھی آنحضورؐ کو ہجوم کفار
میں نہیں چھوڑا۔ جنھوں نے حکم نبیؐ کی تعمیل میں مارا جانا گوارا
کر لیا مگر وہ گھاٹی سے نہ اترے۔ نہ میدان چھوڑ کر پہاڑ پر چڑھے
نہ انھوں نے نبیؐ کی تندرستی میں نبیؐ کا ساتھ چھوڑا نہ بیماری
میں۔ نہ انھوں نے نبیؐ کے جہاد سے منہ موڑا نہ نبیؐ کی صلح
سے۔ وہ نبیؐ کے دفن تک نبیؐ سے وابستہ رہے اور اس
کے بعد نبیؐ کے ارشادات کی تعمیل کو اور اہل بیت نبوت
کی رضا جوئی کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ ایمان لانے
کے بعد ان کا خاتمہ ایمان پر ہوا۔ لیکن آپ ایسے حضرات
کے علاوہ ان کو بھی صحابہ کہتے ہیں جن میں مذکورہ صفات
کا کوئی بھی نشان نہیں۔ مگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم ان کو بھی
مانیں۔ یہ ہمارے بس کا روگ نہیں۔ ہمارا قصور صرف اتنا

مسئلہ تلقین پر مخاطب محترم کا دوسرا اعتراض

فرماتے ہیں :-

" فقہ شیعہ کی مندرجہ تلقین جو میت کے کندھے پکڑ کر اور اسے مخاطب کر کے کی جاتی ہے واضح رہے کہ وہ پنجابی اور اردو میں نہیں بلکہ عربی میں ہے۔ اسمع افھم یا فلان بن فلان اذا اتاک الملکان المقربان رسولین .... الخ اب غور فرمائیے گا کہ ایک غیر عربی کو زندہ ہوتے ہوئے تو عربی پڑھنے کے لیے چار پانچ سال درکار ہوتے ہیں۔ اگر کسی پنجابی کو عربوں کے ہاں بھی رکھا جائے تو پھر بھی عربی سیکھنے میں سال چھ مہینے لگ ہی جائیں گے لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ جونہی "تا زعین" کا سلسلہ

ہے کہ مانتے ہم سب کو ہیں مگر جو جیسا ہے ویسا ہی مانتے ہیں مسلمان کے دفن کے وقت چونکہ کم و بیش ہر فرقہ کے دوست احباب، ہمسایہ، ہم پیشہ جمع ہو جاتے ہیں اس لیے اس موقع پر عقائدِ حقہ کا "تذکرہ ہم جہاں مرنے والے کی روح سے کرتے ہیں وہاں سب کے سامنے ہم اپنے دلی عقائد کا اظہار کر کے مذکورہ غلط افواہوں کی تردید کرتے ہیں خطاب میت سے ہوتا ہے مگر مرنے والے کے ساتھ سب زندوں کو بھی سنا دیتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ کے سوا کوئی نہیں، ہمارے نبی صرف محمد مصطفیٰؐ ہیں۔ ہمارے امام صرف وہ بارہ۱۲ ہیں جن کو امامت اللہ نے دی اور اعلان نبیؐ نے فرمایا۔ ہمارا دین اسلام ہے۔ ہمارا قبلہ صرف کعبہ ہے ہماری کتاب صرف قرآن ہے۔ موت اور موت کے بعد ایمان و عمل کا احتساب برحق ہے۔ روزِ قیامت آنا ہے۔ جزا و سزا، جنت و نار برحق ہے۔

ختم ہوتا ہے الف با تک سے ابلد کسی غیر عرب
کی جان نکلتی ہے تو وہ صرف زندہ نہیں بلکہ
عربی دان بھی ہو جاتا ہے۔"

— ہمارے مخاطب روحِ مجرد کا قیاس روح مع الجسم
پر کر رہے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روحِ منقیدکی صلاحیت
قیدِ جسم کے سبب سے محدود اور کمزور ہو جاتی ہے لیکن
قیدِ جسم سے آزاد ہونے کے بعد اس کی صلاحیت کا ہم
اندازہ نہیں لگا سکتے۔ مادی جسم کے ساتھ روح ایک
گھنٹہ میں چار یا پانچ میل سے زیادہ مسافت طے نہیں کر
سکتی مگر روحِ مجرد کے لیے ایک لمحہ میں بعد المشرقین بھی
کوئی چیز نہیں۔ موجودہ زندگی میں بھی ہر روح کی طاقت
ایک جیسی نہیں۔ نوعِ انسانی کے ایک ہوتے ہوئے ہر
انسانی روح کی طاقت برابر نہیں۔ روحِ انسانی میں ازروئے
قرآن یہ بھی طاقت ہے کہ وہ تختِ بلقیس چشم زدن سے
پہلے ملکِ سبا سے شام کے علاقہ میں لے آئے۔ گہوارہ

میں کلام کرے۔ رات کے ایک حصہ میں مکہ سے مسجدِ اقصیٰ
تک پہنچ کر واپس آجائے پیدا ہوتے ہی سجدہ الٰہی میں
گر پڑے۔ بغیر کسی کتاب دنیا اور انسان دنیا کی تعلیم
کے عالمِ کتاب و حکمت ہو اور علم و حکمت کا آباد اور
معمور شہر ہو۔ کیا وہ معلّم اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ روح
کو ہر بات اور ہر زبان کے سمجھنے کی صلاحیت اپنے ارادۂ
تکوینی سے عطا کر دے۔ اگر ایک عربی ناخواندہ اپنے ناخواندہ
ہونے کی وجہ سے مفہوم تلقین نہیں سمجھ سکتا تو اس دنیا میں
کروڑوں ایسے ہوتے ہیں کہ وہ کوئی نہ کوئی زبان تو بول
لیتے ہیں لیکن اس زبان کو بھی نہ لکھ سکتے ہیں نہ پڑھ سکتے
ہیں۔ ایسے ناخواندۂ محض سے بقول قرآن قیامت
میں کیسے کہا جائے گا کہ لے اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے
"اقرأ کتابک" وہ اللہ کے کہتے ہی پڑھ بھی لے گا اور پڑھ
کر یہ کہے گا۔ مالِ هٰذا الکتاب لا یغادر صغیرۃً
ولا کبیرۃً الا احصاها" یہ نوشتہ کیسا ہے کہ اس

ہیں کہ کوئی چھوٹی بڑی بات لکھنے سے باقی ہی نہیں رہی"۔ اب
یہ خوازرہ بھی ہو گیا اور اسکی یادداشت بھی اتنی تیز کر دیا
گیا ہو گا ہر چھوٹا بڑا کام اسکو یاد آگیا۔ جبکہ وہ زندہ رہتے
ہوئے بہت کچھ بھول جاتا ہے اور یاد دلانے سے بھی
یاد نہیں آتا۔ پھر یہ نامۂ اعمال کس زبان میں ہوگا۔ کیا یہ ہوگا
کہ کسی کا عربی میں، کسی کا فارسی میں کسی کا اردو میں، کسی کا ہندی
میں، سندھی میں، پشتو میں، پنجابی میں، بنگالی میں، یونانی
میں، عبرانی میں، لاطینی میں۔ تو پھر ان لکھنے والے ملائکہ کے
لیے قدرت نے کوئی کالج کھولا ہوگا جس میں ہر زبان کے
پروفیسر ہوں گے۔ اور ان ملائکہ کو ہر زبان کا لکھنا پڑھنا
سکھاتے ہوں گے۔ پھر جنت اور دوزخ میں باہمدگر گفتگو
ہوگی یہ کس زبان میں ہوگی۔ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کی ملائکہ
سے بھی گفتگو ہوگی یہ کس زبان میں ہوگی۔ غرضیکہ مخاطب
محترم نے تلقین کا مذاق اڑا کر قرآن اور دین کا مضحکہ فرمایا ہے۔

محترم مخاطب کا دعویٰ ہے کہ موت کی ساعت اور قیامت کے دن کے درمیان کسی بھی ظاہری یا باطنی زندگی کا قرآن کی رُو سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

مخاطبِ محترم نے مذکورہ دعویٰ کرتے ہوئے دلیل
میں اس آیت کو پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-
ثم انکم بعد ذالک لمیتون ثم انکم
یوم القیامۃ تبعثون ٥ "پھر تم اس پیدا ہونے
کے بعد زندگی گزار کر ضرور مر جاتے ہو۔ پھر تم مرنے کے
بعد قیامت کے دن دوبارہ اٹھائے جاؤ گے"! اب غور
فرمائیے گا کہ آیاتِ بالا میں اسی جسم کا سارا قصہ بیان کیا گیا
ہے۔ جو مختلف مراحل سے گزر کر ماں کے پیٹ سے

پیدا ہوتا اور ضرور مرجاتا ہے اور موت کے بعد پھر ثُمَّ
کی ترتیب و تراخی کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے کہ تم قیامت
کے دن اٹھائے جاؤ گے۔ جس سے دوپہر کے سورج کی طرح
عیاں ہے کہ موت کی ساعت اور قیامت کے درمیان
کسی بھی ظاہری یا باطنی زندگی کا قرآن کی رو سے سوال
ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

۔ جناب والا، آیاتِ بالا میں اسی جسم کا سارا واقعہ
نہیں ہے بلکہ روح کا بھی دوسری آیت میں قصہ موجود ہے
ثُمَّ انشاناہ خلقًا آخر "پھر ہم نے اس جسم کامل کو دوسری
پیدائش یعنی روح عطا کی۔ اب آپ اپنی پیش کی ہوئی آیت
کو میری عینک سے دیکھیے۔ آپ کو صاف نظر آجائے گا
کہ قیامت کے دن کسی کو پیدا نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اٹھایا
جائے گا۔ کیونکہ ثُمَّ انکم یوم القیامۃ تخلقون
نہیں ہے تُبعثون ہے جس کا مصدر ہے بعث۔ یہ لفظ
بعث اس وقت کہا جاتا ہے کہ جب چیز پہلے سے موجود ہو۔

ولادتِ نبی اور بعثتِ نبیؐ کے دن الگ الگ ہیں۔ بعثتِ
نبیؐ کا دن وہ ہے جس سے پہلے اور سالہا سال پہلے نبیؐ
موجود تھے۔ بعثت کے دن آنحضور پیدا نہیں ہوئے بلکہ
اس روز ان کو اللہ نے ہدایتِ خلق کے لیے کھڑا کیا اور
اٹھایا لہٰذا بعثت کے لیے ضروری ہے کہ وجود پہلے
سے ہو۔ آپ کی پیش کی ہوئی آیت میں بھی یہی لفظ بعث
ہے اور جگہ جگہ قرآن کریم میں روزِ قیامت کے لیے یہی
لفظ بعث آیا ہے۔ جیسے من بعثنا من مرقدنا
"قیامت کے روز اٹھائے جانے والے کہیں گے کہ ہم کو
ہمارے مرقد سے کس نے اٹھا دیا؟" ان اللہ یبعث
من فی القبور "جو قبروں میں ہوں گے اللہ ان کو
اٹھائے گا۔" ثُمَّ بعثناکم من بعد موتکم
"پھر ہم نے تم کو تمہاری موت کے بعد اٹھایا۔" چونکہ وہ
روح جو جسم سے الگ کر لی گئی تھی اور وہ موجود تھی۔ اب پھر
اس کا جسم سے اتصال کر دیا گیا جس کے لیے اکثر قرآن مجید

میں لفظ بعث ہے یا کہیں کہیں لفظ احیاء، زندہ کرنا)
آیا ہے۔ اگر ہمارے مخاطب کے بقول موت نے روح
کو محض ناپید اور معدوم کر دیا ہوتا اور روح کا کہیں وجود
ہی نہ رہا ہوتا تو قیامت کے روز اٹھایا جانا یا زندہ کرنا
نہ کہا جاتا بلکہ پیدا کرنا، تخلیق کرنا کہا جاتا۔ اب خدا
کے لیے کہہ دیجیے کہ موت کی ساعت اور قیامت کے
دن کے درمیان روح کی موجودگی قرآن کی رو سے
دوپہر کے اس سورج کی طرح روشن ہے جس پر کوئی بادل
نہ ہو۔

ہمارے مخاطب فرماتے ہیں:-

بروئے آیاتِ بالا ۳۳/۱۲ تا ۱۷ جن میں بعثت کو صرف
قیامت کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔"

غنیمت ہے کہ لفظ بعثت آپ نے استعمال تو کیا مگر
یہ بھول گئے کہ بعثت اسی کی ہوتی ہے جو پہلے سے موجود
ہو۔ دوسری بھول آپ کی یہ ہے کہ آپ کے نزدیک اللہ

نے بعثت کو صرف قیامت کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے حالانکہ
قرآنِ کریم کی رو سے قیامت سے پہلے اس دنیا میں بھی وفات
پائے انسانوں کی بعثت ہوئی ہے۔ حضرت عیسیٰ کا مُردوں
کو زندہ کرنا قرآنِ کریم نے بیان فرمایا ہے۔ اگر مرنے والوں
کی روح معدوم ہو چکی ہوتی تو روح معدوم کے خالق حضرت
عیسیٰؑ نہیں ہو سکتے تھے نہ قرآن نے ان کو خالقِ اموات
کہا ہے۔ اس کے علاوہ قرآنِ کریم نے دو جگہ مُردوں کو اسی
دنیا میں اٹھائے جانے کا ذکر فرمایا ہے:-

۱۔ جب بنی اسرائیل پر بجلی گری اور وہ لوگ ہلاک ہو گئے
اللہ تعالیٰ نے دوبارہ ان کے جسموں میں روح ڈال کر
ان کو اٹھا دیا۔ فرماتا ہے۔ فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ
وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ
بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔
"یعنی تم کو بجلی نے پکڑ لیا اور تم دیکھ رہے تھے پھر
ہم نے تمہاری موت کے بعد تم کو اٹھا دیا تاکہ تم

شکر کرو۔"

۲۔ ایک بزرگ کا گزر کسی ویران آبادی کی طرف
ہوا جہاں کے لوگ گرے ہوئے مکانوں کے نیچے
دبے پڑے تھے۔ ان کی زبان پر حیرت سے
یہ جملہ آیا کہ کس طرح اللہ ان کو ان کی موت کے
بعد زندہ کرے گا۔ اللہ نے خود ان کی ہی روح کو
قبض کر لیا۔ یہ سو۱۰۰ برس تک وہیں مردہ رہے
پھر اللہ نے ان کو زندہ کر کے اٹھا دیا۔ چنانچہ
فرمایا جاتا ہے:۔ او کالذی مرّ علیٰ قریۃ
وھی خاویۃ علیٰ عروشھا قال انّٰی
یحیی ھٰذہ اللہ بعد موتھا فاماتہ
اللہ مائۃ عام ثمّ بعثہ (البقرۃ)
تقریباً ترجمہ آیت اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ آیاتِ
قرآنیہ سے ثابت ہے کہ بعث بعد الموت اس دنیا میں
بھی ہوتا رہا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم ہمارے مخاطب کے

اس جملہ کی تردید کر رہا ہے کہ بعثت کو صرف قیامت
کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ اور ہمارے مخاطب اپنے
اس جملہ سے بیانِ قرآن کی تردید فرما رہے ہیں۔

ہم نے اپنے کتابچہ "صحابیت کا قرآنی تصور" میں کہا تھا
کہ شہداء کے بارہ میں قرآنی لفظ احیاءٌ (وہ زندہ ہیں)
کے معنی مخاطب محترم کے نزدیک "زندہ ہیں" غلطی ہے۔ ان
کے نزدیک صحیح معنی ہیں مردہ قوموں کو زندہ کرنے والے۔
مخاطب محترم کے اس قول پر ہم نے کہا تھا کہ مردہ قوموں کو
زندہ کرنے والے انبیاء خدا سے زیادہ کون ہو سکتے ہیں
اور انبیاء میں سید انبیاءؐ سب سے افضل ہیں۔ نہ ان سے
زیادہ کوئی مردہ قوموں کو زندہ کرنے والا نہ ان سے زیادہ
کوئی مستحق احترام، تو آپ نے ان کے بارہ میں کوئی آیت
پیش نہ کی جس سے ظاہر ہوتا کہ سید انبیاءؐ کو ان کے
احترام ہیں اور اس معنی میں کہ وہ سب سے زیادہ مردہ
قوموں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ حیٌّ (زندہ) کہا گیا ہے

اور ان کو احتراماً اور اعزازاً مردہ کہنے سے روکا گیا ہے
اس کے برخلاف آپ انّك میّتٌ وانھم میّتون
سے نبیؐ کی وفات کو عام لوگوں کی وفات سے برابری دے
رہے ہیں۔ ناظرین غور فرمائیں کہ ہمارا یہ معارضہ کس درجہ
مضبوط ہے کہ جس مجازی معنیٰ میں شہداء کو زندہ کہا گیا
تو جب وجہِ مجاز اور زندہ کہنے کا سبب سید انبیاءؐ کے
لیے بدرجۂ اتم واکمل موجود ہے تو پھر آنحضورؐ کے لیے یہ
لفظ قرآن نے کیوں نہ کہا۔ لیکن ہمارے مخاطب اسکا جواب
مطلقاً نہ دے سکے بلکہ دوبارہ انك میّتٌ وانھم
میّتون کو پیش کرکے موتِ نبیؐ پر مصر ہیں۔ حالانکہ ہم
یہ کب کہہ رہے ہیں کہ جسدِ مقدس نبیؐ سے یا اجسادِ شہداء
سے ان کی پاکیزہ ارواح جدا نہیں ہوئی تھیں لیکن جسموں
سے نکل جانے کے بعد جن ارواح کو جسم مثالی دے کر
اللہ زندہ رکھنا چاہے اس کو زندہ کہنے اور مردہ کہنے
اور سمجھنے سے سب کو روک دے، ان کو زندہ نہ مان کر

اور مردہ سمجھ کر خدا اور رسولؐ، قرآن و حدیث سے دشمنی کیوں
خریدیں۔ اسی ضمن میں ہم نے کہا تھا۔ "حالانکہ اگر آپ دیکھنا
چاہتے تو اسی قرآن میں سید انبیاءؐ کو بلکہ ان کے ساتھ
مخصوص ارواحِ ایمانی کو قیامت تک عمالِ عالمین کا نگران
قرار دیا ہے: قل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ
والمؤمنون ۰ "اے رسولؐ کہہ دو کہ تم عمل کرو عنقریب
تمہارے عمل کو اللہ و رسولؐ اور مخصوص مومنین دیکھتے
رہیں گے۔ ہمارے مخاطب ہمارے ترجمۂ آیت پر بھی معترض
ہیں۔ فرماتے ہیں:۔ "دیکھتے رہیں گے" کہاں سے لے
گئے ہیں حالانکہ ہم کہیں سے بھی نہیں، قرآن ہی سے
لائے ہیں۔ کیا آیت میں فسیریٰ مضارع نہیں ہے؟ اور
کیا مضارع حال اور مستقبل کے لیے نہیں ہوتا؟ اور کیا
فعل یریٰ کا فاعل اللہ نہیں ہے؟ اور اللہ اعمالِ عالمین
کو دیکھتا نہ رہے گا؟ اس سے اور زیادہ مزے دار بات
سنیے۔ مخاطب محترم فرماتے ہیں:۔

حالانکہ عربی ادب کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ
مضارع پہ سین داخل ہو تو اسے مستقبل قریب کے لیے
مخصوص کر دیتا ہے۔

ہمارے مخاطب فاضل کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ
یریٰ پر حرف سین ہے لہٰذا صرف مستقبل قریب کے لیے ہے
جس کی رو سے اللہ اور رسول اور مخصوص مومنین لوگوں کے
اعمال کو ہمیشہ نہ دیکھیں گے بلکہ صرف مستقبل قریب میں دیکھیں
گے اور اس کے بعد اللہ، رسولؐ، المومنون کی نگرانی ختم ہو
جائے گی، کیوں؟ اس لیے کہ رسولؐ اور المومنون وفات پا کر
نیست و نابود ہو جائیں گے اور ان کے ساتھ اللہ میاں بھی
کہیں چلا جائے گا۔ ہمارے مخاطب رسولؐ اور المومنون کو
تو کیوں نہ مانتے ان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اللہ کو بھی
مٹا رہے ہیں۔

میرے عزیز عربی ادب کے ادنیٰ طالبعلم جہاں
یہ جانتے ہیں کہ مضارع پر حرف سین مستقبل قریب کے

معنیٰ دیتا ہے وہاں یہ بھی جانتے ہیں کہ اس فعل کا وقوع مستقبل
قریب میں شروع ہو کر مستقبل قریب ہی میں ختم ہو جائے
یہ ضروری نہیں ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ فعل مستقبل قریب سے
چل کر قیامت تک جاری رہے۔ سورۂ مزمل میں نمازِ شب
کے سلسلہ میں مومنین سے فرماتا ہے علم ان سیکون
منکم مرضیٰ ۔ علم خدا میں ہے کہ عنقریب تم میں
سے لوگ بیمار ہوں گے لہٰذا تم سے جس قدر آسانی سے
ہو سکے نمازِ تہجد پڑھو۔ قیام لیل کا طول و اختصار اپنی
بیماری، مسافرت، روزی کمانے کی مشغولیت پہ نظر رکھ
کر قرار دو۔ اب بتائیے سیکون منکم مرضیٰ "تم میں سے
کچھ لوگ بیمار بھی ہونے رہیں گے" کیا یہاں یکون پر حرف سین
کے آ جانے سے یہ مطلب ہے کہ مومنین مستقبل قریب میں
بیمار ہو کر پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مومنین اور ان کی آئندہ
نسلیں قیامت تک کبھی بیمار نہ ہوں گے؟ کیا یہ حقیقت
نہیں ہے کہ بیماری اور دکھ درد کا سلسلہ مومنین میں

قیامت سے پہلے ختم نہ ہوگا۔ اور مومنین میں سے کبھی نہ
کبھی وہ روزِ قیامت تک بیدار ہوتے ہی رہیں گے لہذا ثابت
ہوا کہ لوگوں کے اعمال کو اللہ، رسولؐ، المومنون قیامت تک
دیکھتے رہیں گے اور رسولؐ، المومنون پیشِ خدا شاہدِ اعمال
ہوں گے۔ یہیں سے یہ ثابت ہے کہ رسول، المومنون
(ائمہ اثنا عشر) بعد وفات بھی زندہ اور ناظرِ اعمال ہیں۔
آیت میں فعل سیری ایک ہے جس کا فاعل اللہ، رسولؐ،
المومنون ہیں تو اگر ایک فاعل یعنی اللہ کا اعمال کو دیکھنا
رہنا مسلسل ہے تو رسولؐ اور المومنون کا اس ہی ایک فعل
کا فاعل ہونا بتا رہا ہے کہ ان کا ناظرِ اعمال ہونا بھی مسلسل
ہے۔ آیتِ مذکورہ کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ سَتُرَدُّوْنَ
الیٰ عالم الغیب والشہادۃ فینبئکم بما
کنتم تعملون۔ تم عنقریب غیب و شہادت کے
جاننے والے (خدا) کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔ پس
وہ خبر دے گا جو تم کرتے تھے سَتُرَدُّوْنَ میں وہی

سین ہے جس کا آپ خود ذکر کر چکے ہیں کہ مستقبل
قریب کے لیے ہوتا ہے۔ فرمائیے کہ بندوں کا اللہ
کی طرف پلٹنا جو مستقبل قریب ہے۔ اس مستقبل
قریب سے کیا مراد ہے؟ اگر قیامت مراد ہے تو واضح
ہوا کہ اللہ کے نزدیک قیامت بھی مستقبل قریب ہے
لہذا "سیری اللہ" والا مسئلہ اور واضح نہ ہوگیا۔ اور اگر
بندوں کے مستقبل قریب میں اللہ کی طرف پلٹنے سے
مراد ہے۔ بندوں کا مرنا تو ثابت ہوا کہ مر کر روحِ انسان
معدوم نہیں ہوتی اور انسان معدوم نہیں ہوتا بلکہ اس
دنیا سے منتقل ہو کر اللہ کی طرف پلٹتا ہے۔ ہمارے
مخاطب نے آیتِ مذکورہ قل اعملوا فسیری اللہ
عملکم ورسولہ والمومنون کے جواب میں
تین آیات کو پیش کیا ہے:۔
۱۔ قل یا قوم اعملوا علیٰ مکانتکم انی
عامل فسوف تعلمون من تکون لہ

عاقبۃ الدار۰
آیت کا ترجمہ جو مخاطب محترم نے کیا ہے۔ اے
قوم تم اپنے مقام پر عمل کرتے جاؤ۔ میں اپنے
مقام پر عمل کر رہا ہوں۔ پس تم جلدی جان لوگے
کہ کامیابی کس کے حصہ میں آتی ہے۔ مخاطب کے
نزدیک کامیابی سے مراد وہ فتح ہے جو جہاد میں ہو۔
حالانکہ عاقبۃ الدار سے مراد اُخروی کامیابی اور سکنِ
خلدِ بریں ہے لیکن مخاطب کے نزدیک کامیابی کی
انتہا اسی دنیا میں ہے۔ آخرت کا انتظار بیکار ہے
ہمارے مخاطب سے کوئی پوچھے کہ اس آیت کو فسیری اللہ
والی آیت سے کیا منافات اور تقابل ہے۔ اس
آیت میں یہ کہاں ہے کہ رسولؐ بعد وفات بالکل
مردہ ہیں۔ وہ کسی کا عمل نہیں دیکھ سکتے۔ آخر یہ
آیت ہمارے کس بیان کی تردید کرتی ہے جس
کی غرض سے آیت پیش کی گئی ہے۔

۲۔ قل یا قوم اعملوا علی مکانتکم انی عامل
سوف تعلمون من یاتیہ عذابٌ
یخزیہ ویحلُّ علیہ عذابٌ مقیم ۰
مخاطب محترم نے ترجمہ کیا ہے۔ تم اپنے مقام پر
عمل کرو میں اپنے مقام پر عمل کر رہا ہوں پس تم
عنقریب جان لوگے کہ (شکست کا) رسواکن
عذاب کس کو پہنچتا ہے۔ آیت کا آخری حصہ نہ
نقل فرمایا نہ اس کا ترجمہ فرمایا یعنی ویحلّ علیہ
عذابٌ مقیم۔ جس طرح پہلی آیت میں
من تکون لہ عاقبۃ الدار کا ترجمہ
کیا تھا فتح سے اسی طرح اس آیت میں عذابٌ
یخزیہ کا ترجمہ کیا ہے۔ لڑائی میں شکست
کھانے سے یہ ہے ہمارے مخاطب کا شوق
فتوحات۔ قیامت ہے کہ روزِ قیامت کے
ثواب و عذاب کو دنیا کی فتح و شکست میں ختم کر لیتے ہیں

ہیں۔ یہاں سے ہم کو شک ہو رہا ہے کہ ہمارے
مخاطب قیامت کے قائل بھی ہیں یا نہیں۔ آیت
مذکورہ کا صحیح ترجمہ یہ ہے ، اے رسولؐ! کہہ دو کہ
اے قوم تم اپنی جگہ عمل کرو میں بھی عمل کرنے والا ہوں
تم عنقریب جان لوگے کہ رسوا کن عذاب (آخرت)
کسکو پہنچتا ہے اور کس پر ہمیشہ رہنے والا عذاب
نازل ہوتا ہے۔ یہ آیت بھی ہمارے حیاتِ نبیؐ
کے دعوے کی کوئی تردید نہیں کرتی۔ مخاطب عزیز
نے بیکار وقت ضائع فرمایا۔

۱۳ - مخاطب عزیز کی پیش کردہ ایک یہ بھی آیت
ہے مخاطب کے نزدیک اس آنے والی آیت کا
حکم بھی آنحضورؐ کی طرف ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔
"یہی قل اعملوا کا حکم آنحضورؐ کی طرف مزید تین
مقامات پر آیا ہے۔" مخاطب عزیز کے یہ
الفاظ ناظرین یاد رکھیں۔ وہ آیت یہ ہے۔ ویا قوم

اعملوا علیٰ مکانتکم انی عامل سوف
تعلمون من یاتیہ عذاب یخزیہ
ومن ھو کاذب وارتقبوا انی معکم
رقیب ولما جاء امرنا نجینا شعیبا
والذین آمنوا معہ برحمۃ منا واخذت
الذین ظلموا الصیحۃ فاصبحوا
فی دیارھم جاثمین۔

ہمارے مخاطب عزیز نے یا تو اس آیت کے
بارہ میں خود دھوکہ کھایا ہے یا مناظرانہ رنگ میں
ہم کو دھوکا دیا ہے۔ اس آیت میں نہ قُل ہے
نہ آنحضورؐ کی طرف کوئی حکم ہے۔ نہ یہ آنحضورؐ
کا قول ہے۔ یہ تو جناب شعیبؑ پیغمبر کا قول ہے
جو اپنی امت سے فرمارہے ہیں۔ اس آیت میں
شروع ذکر اور آخر ذکر دونوں جگہ حضرت شعیبؑ
کا نام تک موجود ہے۔

یہ بیان اس طرح قرآن میں شروع ہوا ہے:۔

قالوا یاشعیب ما نفقہ کثیرا مما تقول
وانا لنرٰک فینا ضعیفا ولولا رھطک
لرجمنٰک وما انت علینا بعزیز قال
یٰقوم ارھطی اعز علیکم من اللہ
واتخذتموہ وراءکم ظھریا ان
ربی بما تعملون محیط ویاقوم اعملوا
علیٰ مکانتکم انی عامل سوف تعلمون
من یاتیہ عذاب یخزیہ ۔ الخ

مخاطبِ محترم کا کمال ہے کہ قولِ جناب شعیبؑ کو اللہ
کا آنحضورؐ کی طرف حکم قرار دے رہے ہیں۔ جس آیت
میں نام تک صاحبِ قول کا موجود ہے اس کو آنحضورؐ
کی طرف لا رہے ہیں جس طرح اشداء علی الکفار
کی مدح کو فتح مکہ کے بعد کے ان مسلمانوں کی طرف لا
رہے ہیں جنھوں نے صفین کا معرکہ گرم کیا جب نام

والی آیت کو مخاطب نے بدل کر رکھ دیا تو جس آیت
میں نام نہیں تھے اس میں تو گنجائش ہی گنجائش تھی۔
یہ ہے تعصب کی انتہا۔ بہرحال ان ہر سہ آیات کو
پیش کر کے مخاطب محترم نے وقت کو ضائع کیا ہے۔
جس قرآن نے حیاتِ نبیؐ کو بیان کیا ہے، وہی
قرآن حیاتِ نبیؐ کی نفی کیسے کر سکتا ہے۔ قرآن میں
اختلاف کیسے ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد مخاطبِ محترم فرماتے ہیں:۔

دوسم آنحضورؐ کو زندہ ماننا حضورؐ کی انتہائی توہین
ہے۔ اگر یہ مانا جائے کہ حضورؐ زندہ ہیں اور
حضورؐ کی موجودگی میں اسلام کو سیکڑوں حصوں
میں تقسیم کر لیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ حضورؐ کے سامنے
ہی بیت اللہ شریف میں چار الگ الگ
مصلے قائم کر دیئے گئے اور آپ نے نبیؐ
ہوتے ہوئے نہ فرقہ وارانہ مسائل ہی حل کیے

نہ اللہ کے گھر کو صاف کیا۔ وغیرہ" پھر لکھتے ہیں:۔

"بقول آپ کے حضورؐ زندہ ہیں اور بوقت تنازعہ
خلافت بھی زندہ تھے۔ تو گویا حضورؐ کے سامنے ہی
بقول آپکے: آپکے وصی کا حق غصب کر لیا گیا اور
آپ نے دخل تک نہ دیا۔"

مخاطبِ محترم کی تقریر کا لبِ لباب یہ نکلا کہ جو نافرمانیاں حضورؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے کیں اگر حضور کو زندہ مانا جائے تو حضورؐ پر الزام آتا ہے کہ آپ نے وہ نافرمانیاں کیوں ہونے دیں اور خود کیوں نہ مداخلت کی؟ حضور والا! نافرمانوں نے حضور اکرمؐ کی موجودگی ہی میں کیا کسر اٹھا رکھی تھی جس کے بارہ میں قرآن کو جابجا کہنا پڑا:۔ ولیتم مدبرین، تولوا منکم، تنازعتم فی الامر وعصیتم، اذ تصعدون ۔الخ ترکوک قائما وغیرذالک ۔ اس وقت تو حضور آپ کے نزدیک زندہ تھے ۔ ان نافرمانیوں سے کیا حضورؐ کی توہین نہ ہوئی؟

اور اگر توہین کے ڈر سے آپ رسولؐ کو محض ایک مردہ سمجھنا چاہتے ہیں تو خدا تو زندہ ہے۔ آپ حیٌ لایموت کو کیوں بھول گئے۔ اس دنیا میں کیا نہیں ہوا اور کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ مگر اللہ موجود ہے۔ زندہ ہے، باخبر ہے دخل دینا تو الگ رہا ٹس سے مس بھی نہیں۔ کہہ دیجیے کہ وہ بھی مردہ ہے۔ کچھ بھی نہیں بولتا ۔ جناب والا وہ کیوں بولے! جو کچھ اس کو کہنا تھا کہہ چکا۔ جو کچھ نبیؐ کو سمجھانا تھا سمجھا چکے۔ اب آزمائش ہے کہ کون مانتا ہے کون نہیں مانتا جیسے کہ طلبہ کو سب کچھ لکھانے پڑھانے کے بعد ممتحن امتحان لیتا ہے اور امتحان کے وقت اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ نہ ممتحن صحیح کام کرنے والے کو داد دیتا ہے نہ غلط کام کرنے والے کو ٹوکتا ہے۔ اس لیے کہ اب تعلیم کا وقت نہیں امتحان کا وقت ہے جس کے بعد نتیجہ کا دن آ رہا ہے جس کا نام روز جزا ہے۔

قرآنِ کریم سے حیاتِ نبیؐ پر دوسری دلیل

آپ نے قرآن کریم میں یہ آیت بھی ضرور دیکھی ہوگی
کہ نبیؐ بروزِ قیامت اپنے رب سے کہیں گے یارَبِّ انّ
قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا۔" اے میرے
رب میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔" لامحالہ نبیؐ کی یہ
شکایت اپنے بعد ہی کے زمانہ کی ہوگی۔ تو اگر نبیؐ اپنی وفات
کے بعد معدوم ہو گئے اور ناظرِ اعمال نہ رہے تو یہ شکایت کیسی؟
آپ نے ہم سے فرمایا ہے کہ آلاعتقدم ہی سے پوچھ لیا ہوتا کہ
وہ حیاتِ نبیؐ کا قائل ہے یا نہیں؟ تو جناب والا پوچھتا ہے
وہ جو بے خبر ہو۔ باخبر پوچھا نہیں کرتا بتایا کرتا ہے۔ اس کے
علاوہ ہم کو پوچھنا ہوتا تو ہم کبھی ان بڑی بڑی بارگاہوں میں
پوچھنے نہیں جاتے جنھوں نے دین وایمان علم وعمل جلد یا
بدیر دنیا میں آکر عمر کا طولانی حصہ گزار کر سیکھا ہو یا سیکھنے کا نام
کرلیا ہو۔ ہم پوچھتے ہیں ان سے جو یہاں آکر عالم نہیں ہوتے
بلکہ عالم ہو کر یہاں آتے ہیں ان کا معلم خود خدا اور وہ عالم ہوتا

ہے۔ خلافت کی خشتِ اول حضرت آدمؑ کے لیے قرآن طے
کرچکا ہے کہ اللہ نے ان کو زمین پر آنے سے پہلے کل حقائق
تعلیم فرما دیے تھے وہ صاحبِ علم ہو کر زمین پر گئے۔ چونکہ
سنتِ الٰہی کبھی نہیں بدل سکتی لہٰذا یہی سلسلہ آخر تک
جاری رہا۔

ہمارے مخاطبِ محترم ایک جگہ فرماتے ہیں:۔
یا داود انا جعلناک خلیفۃ فی الارض
فاحکم بین الناس بالحق۔ "اے داؤدؑ ہم نے
آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ پس آپ لوگوں میں حق کے
ساتھ حکم فرمایا کریں۔ یہ ہے خدا تعالیٰ کی عطا کردہ خلافتِ
ارضی جو وہ اپنے وعدہ کے مطابق عطا فرماتا ہے۔"
بے شک یہ ہے خدا تعالیٰ کی عطا کردہ خلافتِ ارضی
جس میں نہ اجماعِ امت کا دخل ہے نہ کسی کی رائے اور مشورہ
سے خلیفہ بنایا گیا ہے خود اللہ نے خلیفہ بنایا۔ یہی نشان
تو ہے جس کو ہم ہر جگہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

مخاطب محترم کا ایک اور جملہ۔

"فلہٰذا یہ نظریہ غیر قرآنی ہے کہ حکومت تو خدا تعالیٰ کا کوئی نافرمان کر رہا ہو اور جس فرد محترم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدۂ خلافت ہو وہ یا تو اس کے ماتحت تقیہ کیے ہوئے ہو اور یا اسکی قید میں ختم ہو جائے۔"

مطلب یہ ہوا کہ اس دنیا میں جب بھی جس نے حکومت کی اسکی حکومت ہی اسکی دلیل ہے کہ وہ اللہ کا فرماں بردار اور اللہ کا بنایا ہوا خلیفہ ہے وہ چاہے فرعون ہو یا نمرود، یزید ہو کہ مروان۔ یہ عقیدہ آپ کو مبارک ہو۔

مخاطب محترم نے آیتِ مجیدہ ۳۸/۳۲ انی احببت حب الخیر عن ذکر ربی اور آیت ۲/۱۰۲ ما انزل علی الملکین کا ایک ترجمہ مولوی ثناء اللہ صاحب اہل حدیث کا اور دوسرا ترجمہ مولوی سید مقبول احمد صاحب کا لکھ کر سوال کیا ہے کہ ان دونوں میں سے کس بزرگ کی تفسیر رسولی ہے اور کونسا بزرگ رسولی تفسیر کا منکر ہے۔"

جناب والا۔ نبیؐ نے خود کوئی ترجمہ اردو وغیرہ میں نہیں کیا۔ لہذا کوئی ترجمہ بھی رسولی نہیں ترجمہ کو تفسیر کہنا فریب کھانا اور فریب دینا ہے۔ اہل زبان اپنی زبان کو سمجھتے تھے، تفسیر کہتے ہیں اصطلاحی الفاظ کے مفہوم کو یا ان جزئیات کے بیان کو جو کلیات ذکر کے تحت میں آتے ہیں اور قرآن نے خود ان کو بیان نہیں فرمایا بلکہ اس کا بیان نبیؐ پر چھوڑ دیا جیسے صلوٰۃ، زکوٰۃ کا مفہوم شرعی کیا ہے۔ اس کی مقدار اور اس کے شرائط کیا ہیں یا جیسے لفظ اصحاب کہف کے تحت میں یہ کہ وہ کتنے تھے۔ ان کے نام کیا تھے۔ وغیر ذالک۔ یہ کہلائے گی تفسیر رسولی تفسیر کا کوئی مسلمان اہل حدیث ہو یا شیعہ یا کچھ بھی کوئی بھی منکر نہیں ہو سکتا البتہ رسولی تفسیر کے حاصل کرنے کے ذرائع مختلف ہیں۔ کسی نے وہ ذریعہ اختیار کیا جو بقول آپ کے منزہ عن الخطا نہ تھے اور ایک جیسے نہ تھے کسی کے پاس ان کا ذریعہ ہے جو منزہ عن الخطا اور معصوم ہیں جن

کی پاکیزگی اور کمال پاکیزگی کا آورخش کے پاس علم الکتاب ہونے کا قرآن کریم نے اعلان کیا ہے۔

منافقین پر برابر پردے ڈالے جا رہے ہیں

ہمارے مخاطب محترم نے بلاغ القرآن اگست ۷۸ء میں تحریر فرمایا تھا کہ "کافر کہتے ہیں کہ یہ رسول کان ہیں۔" میں نے اپنے مقالہ "صحابیت کا قرآنی تصور" میں ان سے عرض کیا تھا کہ یہ آیت سورۂ توبہ کی آیت ہے۔ آیت میں یہ قول کفار کا نہیں بتایا گیا بلکہ منافقین کا بتایا گیا ہے جو نماز پڑھتے تھے از کوٰۃ دیتے تھے۔ ہم نے مذکورہ آیت کے ساتھ اس سے پہلی اور بعد کی آیت نقل کرکے واضح کر دیا تھا کہ رسول کو کچے کانوں کا کہنے والے منافقین تھے جن کو ہمارے مخاطب نے کافر کہہ کر منافقین کے وجود پر پردہ ڈالا ہے کیونکہ ہمارے مخاطب کا یہ لفظ کہ کافر کہتے ہیں، جو شخص بھی دیکھے گا یہی سمجھے گا کہ یہ لفظ وہ لوگ کہتے تھے جو کھلم کھلا نبیؐ کی نبوت سے انکار کرتے تھے اور یہی ہمارے مخاطب کی کوشش ہے کہ آج کے مسلمانوں کو کسی طرح یہ تصور تک نہ پیدا ہو کہ عہدِ پیغمبرؐ میں کچھ لوگ منافقین بھی تھے۔ ہماری اس گرفت پر ہمارے معاصر عزیز نے لکھا ہے کہ "ہم پوچھتے ہیں کہ کیا قرآن کریم نے منافق کو کافر نہیں کہا۔" کوئی بتائے کہ یہ کوئی جواب ہوا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا قرآن کریم نے منافق کو منافق نہیں کہا؟ جب منافق کے لیے ایک صاف اور معین لفظ ہے تو اس کو چھوڑ کر لفظ کافر کہنے کی وجہ اور ضرورت کیا پیش آئی تھی۔ قرآن کریم نے منافق کی باطنی کیفیت کی بنا پر منافق کو کافر بھی کہا ہے اور اس کی ظاہری حالت کی بنا پر اس کو مومن و مسلم بھی کہا ہے اور اس کی دورنگی کی بنا پر اس کو منافق بھی کہا ہے لیکن اس کے لیے صریحی لفظ ہے منافق جس کے ساتھ کسی تشریح کی ضرورت نہیں، ورنہ جب منافق کو کافر کہا جائے گا تو یہ شرح ضروری ہوگی کہ وہ باطناً کافر ہے اور ظاہراً مومن ہے۔ اسی طرح جب اس کو

مومن کہا جائے گا تو اس بات کا نشان دینا ہوگا کہ وہ ظاہراً مومن ہے باطناً نہیں۔ آپ نے بغیر شرح کے فرمادیا کہ کافر کہتے ہیں کہ یہ رسول کان ہیں۔ یہ دنیا کو مغالطہ دینا نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر ایک شخص یہ بیان کردے کہ کل ایک آدمی کو شیر نے ہلاک کردیا بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے غلط کہا۔ شیر نے نہیں کسی آدمی نے ہلاک کیا تھا باز پرس کرنے پر وہ جواب میں کہہ دے کہ کیا نڈر اور بہادر آدمی کو شیر نہیں کہا جاتا تو یہ کوئی جواب ہوا۔ بے شک ایسے آدمی کو شیر کہا جاتا ہے مگر اس کا آدمی ہونا چھپایا نہیں جاتا۔ آدمی کو شیر کہنے کے لیے ضروری ہے کہ کسی انداز میں اس کا آدمی ہونا ظاہر کر دیا جائے ورنہ بیان کو دروغ اور غلط ضرور کہا جائے گا قرآنِ کریم نے منافق کو جہاں کافر کہا ہے وہاں اسکو مومن بھی کہا ہے کیونکہ منافق ایک اعتبار سے کافر ہے تو دوسرے اعتبار سے مومن ہے۔ اور دونوں اعتبار کو ملا کر منافق ہے قرآنِ کریم میں جہاں بھی یا ایھا الذین آمنوا کہکر خطاب

کیا گیا ہے اس خطاب میں مومن اور منافق سب شامل ہیں یا ایھا الذین آمنوا کہہ کر جو حکم بھی اللہ نے دیا ہے اس حکم کے محکوم سب ہیں۔ نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حکم منافق کو نہیں دیا گیا نہ منافق کہہ سکتے ہیں کہ یہ حکم مجھ کو نہیں دیا گیا۔ جب اس خطاب میں ہر مدعیٔ ایمان مخاطب اور محکوم ہے چاہے وہ حقیقتاً مومن نہ ہو تو قرآن نے منافق کو بھی (اس کے دعوے کی بنا پر) ایمان لانے والا فرمایا۔

قرآنِ کریم نے منافق کو اس کے ظاہر کے اعتبار سے مومن کہا ہے

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ یا ایھا الذین آمنوا کے خطاب میں اور اس کے بعد والے حکم میں مومن اور منافق سب ہیں اور اس طرح قرآنِ کریم منافق کو بھی ایمان لانے والا کہہ رہا ہے اسی طرح دوسری آیاتِ قرآنی ہیں جن میں لفظ مومن میں منافقین داخل ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ [illegible]

اَخرَجَكَ رَبُّكَ مِن بَيتِكَ بالحقِّ وَاِنَّ فريقًا

من المومنين لكارهون يجادلونك في الحق

بعد ما تبين كانما يساقون الى الموت وهم

ينظرون ـ الانفال رکوع ۱ ۔ (تقسیم مال غنیمت کا جھگڑا

بھی) ایسا ہی ہے کہ اے نبی تم کو اللہ نے تمہارے گھر سے

حق کے ساتھ نکالا تھا۔ اور اس وقت مومنین میں سے

ایک گروہ یقیناً حکم خدا سے کراہت کر رہا تھا وہ اے نبیؐ

تم سے امر حق کے بارہ میں جھگڑتے ہیں جبکہ حق واضح ہو چکا

ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو کھلی آنکھوں موت کی طرف

ہنکایا جا رہا ہے۔ جن لوگوں کو حکم خدا کی تعمیل مکروہ اور

ناگوار تھی جو نبی سے حق کے واضح ہو جانے کے بعد جھگڑ رہے

تھے اور جو حکم خدا کی تعمیل کو موت کے منہ میں دھکیلا جانا سمجھ

رہے تھے ان کو قرآن کریم مومنین ہی میں کا ایک فریق بتا رہا

ہے۔ یہ علامتیں جتنے سچے مومنین کی تو ہو نہیں سکتیں لہذا

ان کو مومن ان کے دعوائے ایمان ہی کی بنا پر کہا جا رہا ہے

یا تو یہ کل کے کل منافق تھے ورنہ یہ تو یقینی ہے کہ منافق

اسی فریق میں سے تھے لہذا ثابت ہوا کہ منافقین کو ان

کے ظاہر اور ان کے دعوے کی بنا پر مومن کہا جا رہا ہے۔

دوسری آیت :۔

وان طائفتان من المومنين اقتتلوا

فاصلحوا بينهما ج فان بغت احدهما على الاخرى

فقاتلوا التي تبغي حتى تفيء الى امر الله فان

فاءت فاصلحوا بينهما بالعدل واقسطوا ان

الله يحب المقسطين ه الحجرات رکوع ۱۔

" اور اگر کسی وقت ایمان لانے والوں میں سے دو گروہ

باہم قتال کریں تو تم دونوں کے درمیان اے مسلمانو اصلاح

کرو۔ پس اگر ان میں سے کوئی ایک (صحیح رستہ پر نہ آئے)

اور دوسرے گروہ کے مقابلہ میں بغاوت کرے تو تم سب

گروہ باغی سے قتال کرو تا اینکہ وہ باغی گروہ حکم خدا کی طرف

جھکے۔ پس اگر وہ باغی جھک گیا تو تم دونوں کے درمیان

صلح و صفائی کرا دو۔ اور انصاف سے کام لو۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" اس آیت میں نبیؐ سے خطاب نہیں ہے بلکہ عام مسلمانوں سے ہے۔ صرف نبیؐ سے خطاب ہوتا تو اصلح کہا جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان کے دعوے داروں کا اس درجہ سرکش ہو جانا کہ اس گروہِ باغی سے قتال عام مسلمانوں کا فرض ہو جائے اور باقاعدہ قتال کا بازار گرم ہو جائے اتنا سنگین واقعہ نبیؐ کی موجودگی میں نہیں بلکہ حضورؐ کے بعد ہی رونما ہو سکتا ہے۔ اب اندازہ لگایئے کہ جس گروہ کو اللہ تعالیٰ باغی قرار دے دے اور اس گروہ باغی کے قتلِ عام کا حکم دے دے کیا یہ گروہ واقعاً مومن ہو سکتا ہے؟ اور اللہ قتلِ مومنین کا حکم دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ لیکن اللہ نے وان طائفتان من المومنین اقتتلوا کہہ کر اس باغی گروہ، مستوجبِ قتل کو بھی مومن کہا۔ اور جس گروہ پر یہ بغاوت ہو رہی ہے اس کو بھی مومن کہا۔ جب گروہِ باغی جو مستوجبِ قتل ہو مومن

نہیں ہو سکتا تو پھر قرآنِ کریم نے اس کو مومن کیوں کہا؟ حضرت اس لیے کہ وہ ایمان ظاہر کرتا ہے اور اپنے آپ کو مومن کہتا ہے، حالانکہ اس کے دل میں نورِ ایمان نہیں۔ لہٰذا آیات سے ثابت ہو رہا ہے کہ منافقین کو بھی قرآنِ کریم نے نظر بر ظاہر مومن کہا ہے۔ تو پھر ہمارے مخاطب نے بجائے اس کے کہ "کافر کہتے ہیں کہ یہ رسول کان ہیں" یہ کیوں نہیں فرمایا کہ مومن کہتے ہیں کہ یہ رسول کان ہیں۔ آیتِ مذکورہ میں جس قتال اور بغاوت کا ذکر ہے یہ بے وجہ تو نہیں۔ یہ ہونے والی بات کب ہوئی۔ جمل، صفین، نہروان کی جن جنگوں کو آپ افسانہ بتاتے ہیں ان کی طرف قرآنِ کریم خود اشارہ کر رہا ہے۔ اب آپ اپنی ہر بات کا جواب لیجیے۔ اس ہی آیت سے میں آپ کے ہر جملہ کو نقل کر کے جواب آیت سے دیتا ہوں۔

ارشاداتِ مخاطبِ محترم:	آیت سے جواب:
"یہ ہزاروں مسلمانوں کا قتل	یہ بات آیت سے پوچھیے۔

قتل بالعمد نہیں"؟ (جنگِ جمل وصفین میں)

"قرآن کے کہنے پر اگر ان افسانوی (جمل وصفین وغیرہ) جنگوں کا انکار کر دیا جائے تو کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑیگا؟"

قرآن کے کہنے پر بھی اگر ان واقعی جنگوں کا انکار کر دیا جائے تو انکارِ قرآن کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔

"جنگِ جمل وصفین منوانے کے لیے قرآنی مسلمات سے انکار کیوں؟"

قرآنی مسلمات کے ہوتے ہوئے جنگِ جمل وصفین سے انکار کرنا قرآنی مسلمات سے انکار ہوگا۔

"کیا رحماء بینھم کا معنیٰ یہ ہے کہ پورے جوش وخروش کے ساتھ ایک دوسرے کو قتل کیا جائے؟"

جن کے لیے رحماء بینھم کہا گیا ہے ان کو حکمِ خدا ہے کہ وہ بھرپور طاقت سے اہلِ بغاوت سے جو بے رحم ہیں ان سے قتال کریں۔

"کیا تحریفِ قرآن کا مسلمہ

یہ آپ جانیں یا وہ جنہوں نے

ہمارے لیے قابلِ قبول ہے؟"

آیتِ رجم کی نایابی کی فریاد کی،

"کیا یہ جنگیں غلط ہیں یا قرآن غلط ہے؟"

ان جنگوں کے وقوع کی طرف خود قرآن اشارہ کر رہا ہے لہٰذا نہ یہ جنگیں غلط ہیں نہ قرآن غلط ہے۔

"جنگِ جمل وصفین میں کام آنے والے شہید تھے یا مقتول؟"

جن کو حکم تھا کہ وہ اہلِ بغاوت سے قتال کریں ان میں جو مقتول ہوئے وہ یقیناً شہید ہیں۔ باقی کو آپ جانیں۔

"کیا صحابہ دھوکہ باز تھے؟ اور قیادت دھوکہ شناس تھی؟"

ہماری دلی تمنا ہے کہ صحابہ کو دھوکہ باز نہ کہیے مگر دھوکہ باز کو صحابہ بھی نہ کہیے۔ رہی قیادت کی دھوکہ شناسی یا ناشناسی تو کسی پردہ نشین مستورہ کا

دھوکہ میں آجانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔

"دس ہزار نفوس کا قتل اور بلا عمد، العجب ثم العجب"

قتل ہر طرف سے عمداً ہوا کسی نے دنیا کے لیے قتال کیا کسی نے بحکمِ خدا اور آخرت کے لیے۔

"کیا فریقین کے مقتولین بلا عمد کا قاتلین سے خون بہا لیا گیا؟"

بلا عمد کہا کس نے ہے؟

"کاش کہ ناموسِ علیؑ پر ہی رحم کیا ہوتا۔"

علیؑ نے بحکمِ خدا اور بحکمِ آیت قتال کیا۔ وہ خود مومنین پر رحم کرنے والے ہیں۔

"کیا مقتولین کے ورثائے خون بہا معاف کر دیا تھا؟"

شہیدوں کا قصاص ہرگز معاف نہیں کیا گیا۔ روزِ جزا آرہا ہے۔

"سابقون کے ہاتھوں سابقون

آپ کر دونوں طرف سابقون

کا اور اہلِ بدر کے ہاتھوں اہلِ بدر کا قتل معاذ اللہ"

کہاں سے نظر آگیا۔ یہ محض سبقتِ قلم ہے۔ اہلِ بدر حقیقتاً وہ ہیں جنھوں نے بدر بھی فتح کی تھی اور اب بھی بحکمِ خدا قتال کر رہے ہیں۔

جنگِ صفین پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"اور اس سلسلہ میں تضاد کی حد یہ ہے کہ کبھی تو انھیں مسلمان تسلیم کر رہے ہیں اور کبھی منافق ٹھہرانے کی کوشش فرماتے ہیں۔"

منافق خود کو مسلمان نہ کہتے تو وہ منافق ہی کیوں کہلاتے لہٰذا ان کو میں نے اور قرآنِ کریم نے مسلمان کہا ہے، ان کے دعوے کی بنا پر۔ لہٰذا تضاد نہ میرے بیان میں ہے نہ قرآنی بیان میں۔ اگر اسی کا نام تضاد ہے تو یہ تضاد قرآنِ کریم میں بھی ہے جس

"یہ ہیں کلاً وعد اللہ الحسنیٰ والے حقے سچے مومن، جنہیں "پیام عمل" ایک دوسرے کا قاتل ٹھہراتا ہے۔"

سے میں نے بھی حاصل کیا۔ اگر آپ یہ کہہ دیں کہ ان طائفتان من المومنین اقتتلوا .... فقاتلوا التی تبغی یہ آیت "پیام عمل" والوں نے شامل قرآن کردی ہے تو ہوسکتا ہے کہ حقے سچے مومنین کو "پیام عمل" ایک دوسرے کا قاتل ٹھہراتا ہے۔ ورنہ فقاتلوا التی تبغی یہ الفاظ قرآنی حقے سچے مومنین کو حکم دے رہے ہیں کہ وہ نام نہاد مسلمانوں سے قتال کریں۔

غرضیکہ بلاغ القرآن ۶۷ء میں پوری کوشش کی گئی

تھی کہ منافقین کا لفظ تک کسی نگاہ میں نہ آئے۔ چنانچہ فرما دیا کہ کافر کہتے ہیں کہ یہ رسول کان ہیں۔ لیکن جب ہم نے صحابیت کا قرآنی تصور لکھ کر آیاتِ قرآنی سے منافقین کا ہجوم و عموم ثابت کر دیا تو ہمارے مخاطب نے تحفظ ناموس صحابہ نمبر میں منافقین پر پردہ ڈالنے کا ایک اور طریقہ اختیار کیا اور یہ تصنیف کر لیا کہ نبیؐ نے اپنی زندگی ہی میں تمام منافقین کا صفایا کر دیا تھا اور وفاتِ رسولؐ کے وقت جماعتِ صحابہ میں کوئی بھی منافق باقی نہیں تھا۔
(تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص ۵۲)

پھر فرماتے ہیں کہ:۔

آنحضورؐ نے اپنی زندگی میں جس طرح حکم خداوندی کے مطابق کافروں کا خاتمہ کر دیا تھا یعنی یا تو وہ ملک چھوڑ کر چلے گئے، یا مومن ہو گئے اور یا ذمی بنکر دائیں ہاتھ سے جزیہ ادا کرتے رہے۔ ۹/۲۹ اسی طرح آنحضورؐ نے ۹/۷۳ اور ۶۶/۹ کے حکم خداوندی

کے مطابق قلمرِ مصطفوی ؐ سے منافقوں کا بھی خاتمہ
کر دیا تھا اور یہ خلافت کے جھگڑے اور قلم دوات
کے شاخسانے سب نام نہاد احادیث اور
نام نہاد تاریخ کی صورت میں دشمنانِ اسلام
کے گھڑے ہوئے تھے " ص۵۳ . تحفہ نمبر
پھر فرماتے ہیں :-

"قلمرو مصطفوی ؐ سے ایک ایک منافق کو
چن چن کر ختم کر دیا گیا تھا ۔"

غرضیکہ مخاطب محترم پہلے تو منافقین کا وجود ہی نہیں
دکھانا چاہتے تھے جب اس میں کامیابی نہ دیکھی تو یہ نیا
راستہ بنایا کہ منافقین تھے تو مگر ان کا خاتمہ کر دیا گیا تھا ۔
منافقین دس بیس، پچاس، سو تو نہ تھے ان کی جماعت بڑی
زبردست جماعت تھی جس میں اضافہ ہوتا چلا گیا تھا یہاں
تک کہ غلبۂ اسلام سے بے بس ہو کر آخر میں ایک اور پوری
جماعت اپنی جانوں کے بچانے کے لیے اسی صف میں داخل

ہو گئی ۔ اتنی بڑی جماعت کا قتل عام یوں تو نہیں ہو سکتا
تھا کہ سب کو بلا کر کہہ دیا جائے کہ جھکاؤ گردن، مارو تلوار،
انھوں نے حکم ہوتے ہی گردنیں جھکا لیں اور وہ لگے کٹنے ۔
ایسے فرماں بردار ہوتے تو منافقین ہی کیوں ہوتے ۔ اگر ایسے
فرماں بردار ہوتے تو حکم نبی ؐ کی مخالفت کر کے پہاڑ کی گھاٹی
سے کیوں اترتے اور میدان سے رسول ؐ کو پکارتا دیکھ کر کیسے
چلے جاتے اور کیونکر ایسی لمبی تانتے کہ تین روز کے بعد پلٹتے
یہ لوگ یوں تو خوشی سے جانیں دینے والے نہ تھے ۔ ان کا
قتل عام باہمی شدید قتال اور خون ریز جنگ کے بغیر
تو ہو نہیں سکتا تھا ۔ اگر وہ مارے جاتے تو اس طرف کے
بھی ان کے ہاتھ سے مارے جاتے اور جنگ کا ایک میدان
تو فیصلہ کن نہیں ہو سکتا تھا ۔ میدان سے بھاگ جاتے
کے یہ دیرینہ مشاق تھے ۔ مغلوب ہوتے تو کیا آج میدان
ہی میں کھڑے رہتے ۔ کوئی پناہ کی جگہ نہ ڈھونڈتے ؟ آج
بھاگ کر کل پھر سنبھل کر مقابلہ نہ کرتے ۔ اسی طرح نہ معلوم

تو اسکو باہر نکال کر ہوا دی ہوتی - اور جب یہ کچھ نہیں تو
پھر یہ محض ایجادِ بندہ من گھڑت ہے جو نبیؐ پر بہتانِ
محض ہے - ہمارے مخاطب نے یہ تک نہ سوچا کہ جس
عہد میں کفار سے جنگ پر جنگ ہو رہی تھی اگر اسی
سلسلہ میں مومنین اور منافقین کی جنگ چھڑ جاتی تو یہ
جنگ تنہا منافقین سے کیسے رہ سکتی تھی - اس جنگ میں
منافقین کا ساتھ خوش ہو کر کفار نہ دیتے اور کفار کا ساتھ
منافقین نہ دیتے - یہ دونوں ایک تو تھے ہی ایک ہو کر
نہ لڑتے - جب بقول آپ کے وفاتِ نبیؐ کے وقت ایک
بھی منافق باقی نہ تھا تو قتالِ منافقین کے واقعہ کو چھپاتا کون؟
وفاتِ نبیؐ کے وقت مجمع خالص مومنین کا مگر حق بات
کوئی نہیں کہتا - تو پھر یہ بات تو نہ تھی کہ نبیؐ کی وفات
کے وقت کوئی منافق باقی نہ تھا - بات تو اس طرح بنتی ہے
کہ وفاتِ نبیؐ کے وقت ایک بھی مومن باقی نہ رہا تھا -
معاذ اللہ - ۱۲ھ کی جنگ کوئی اسلامی اور دینی جنگ

کتنے معرکے پیش آتے - ہمارے مخاطب محترم تو احد اور
حنین سے بھاگنے والوں کو پکا سچا مومن بلکہ اصحاب تک
بتا رہے ہیں تو جب مخاطب کے نزدیک سچے مومن بھی
جن کی روک ٹوک کے لیے سر پر رسولؐ موجود ہیں جنگ سے
بھاگ سکتے ہیں تو یہ لوگ تو بے شبہ تھے ہی منافق
جنگ سے بھاگنے میں ان کو اپنے کون سے ایمان کے
رخصت ہونے کا ڈر تھا - اگر عہدِ نبیؐ میں منافقین سے
جنگ پر جنگ ہوئی ہوتی اور ان کا بار بار قتلِ عام ہوا
ہوتا تو دنیائے اسلام اس کو حرفِ غلط کی طرح کیسے مٹا
دیتی اور کیسے مٹا سکتی - ایسے عظیم واقعہ کو عالمِ اسلام
کیوں فراموش کرتا اور کیسے فراموش کر سکتا تھا - کوئی قلم
تو لکھتا ، کوئی کتاب تو بتاتی ، کوئی زبان تو کہتی - سب کو
نہیں تو بعض کو تو یاد رہتا کہ کس زمانہ میں یہ واقعہ ہوا - کس
جگہ ہوا ، کس طرح ہوا - یہ ذکر میں آتا اگر مخاطب محترم
کے پاس ایسے اسرار کو منکشف کرنے والی کوئی کتاب ہے

نہ تھی۔ لیکن اگر آج کوئی کہے کہ جنگِ عظیم ہوئی ہی نہیں محض
افسانہ ہے تو ہر مسلمان کہے گا کہ جھوٹ ہے، جھوٹ ہے۔
جنگ ضرور ہوئی تھی۔ اگر منافقین سے بحکمِ خدا قتال ہوا
ہوتا تو اس قتال سے اگر کوئی انکار بھی کرتا تو ہر مسلمان شور
مچا دیتا کہ جھوٹ ہے۔ دینی جنگ سے انکار کرنا دین
سے انکار ہے۔ ہمارے مخاطبِ محترم کیا اس معنیٰ میں
فاضل ہیں کہ ان کی ہر بات فضول ہے۔ وہ کیسے عاقل
ہیں کہ کوئی بات معقول نہیں۔ کیسے قابل ہیں کہ کوئی بات
مقبول نہیں۔ منافقین تو رہے الگ، خاتمہ تو کفار کا بھی نہ
ہوا تھا۔ نبیؐ آخر دم تک کفار سے جہاد فرماتے رہے۔
آخری بیماری میں بھی جیشِ اسامہ کو علم دار بنا کر کفار سے
لڑنے کے لیے بھیجنا چاہتے رہے اور لشکرِ اسلام کی روانگی کا
حکم دیتے رہے۔ اکابر صحابہ کو اسامہ بن زید کی ماتحتی
میں جانے کا حکم دیتے رہے مگر مسلمانوں کی اکثریت
نے سرکار کی بیماری کی شدت دیکھ کر مدینہ سے اپنی روانگی

کو مناسب نہ سمجھا یہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ نبیؐ کی یہ بیماری
خطرناک ہے نہ معلوم کس وقت وفات ہو جائے۔ غرضکہ
لشکر والے کچھ مدینہ میں ہی تھے۔ کچھ مدینہ کے باہر کچھ ہی
دور گئے تھے کہ آنحضورؐ کی وفات ہو گئی۔ اگر ان لوگوں کا
مدینہ میں رہنے کا خواہشمند ہونا اور نبیؐ کی اس خطرناک
حالت میں ان کا سفر کو گوارا نہ کرنا۔ اس عقیدت و محبت
کی بنا پر تھا کہ نبیؐ کے آخر وقت میں ہم نبیؐ کو کیسے چھوڑ دیں
نبیؐ کی شرکت جنازہ سے ہم کیوں محروم رہیں تو یہ پہلو
شرعاً کیسا ہی ہو مگر فطرۃً برا نہیں لیکن حقیقتاً اس التوا
سفر کا سبب کیا نبیؐ کے جنازہ اور دفن میں شرکت کی
آرزو تھی یا کوئی دوسری مصلحت تھی یہ واقعات مابعد
سے پوچھیے یا نبیؐ کے جنازہ سے پوچھیے۔ غرضکہ وفات
کے وقت منافقین تو جوں کے توں سب ہی موجود تھے۔ کفار
کا بھی خاتمہ نہ ہوا تھا نہ کفار کو ختم کرنے کا کوئی حکمِ خدا
آیا تھا۔ آپ نے کفار کے خاتمہ کے ثبوت میں آیتِ قرآنی

کو پیش کیا ہے یعنی قاتلوا الذین لا یومنون باللہ
ولا بالیوم الآخر الخ ۹/۲۹ لیکن آپ نے یہ نہ دیکھا
کہ حکم قتال صرف ان مشرکین اور اہل کتاب سے ہے
جنھوں نے نقض عہد کیا تھا اور معاہدہ کے خلاف مسلمانوں
کو قتل کیا تھا جس کا ذکر آغاز آیت میں تفصیل سے
آچکا ہے ورنہ جن کفار نے اپنے عہد کو نہ توڑا تھا ان کو حکم
قتال سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا جاتا ہے۔
الا الذین عاھدتم عند المسجد الحرام
فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم ان اللہ
یحب المتقین ۵ مشرکین جو اپنے عہد کے پابند
نہ رہے ان کے لیے اللہ کے نزدیک بھی کوئی عہد باقی نہیں
سوائے ان کے جن سے تم نے المسجد الحرام کے نزدیک عہد
کیا ہے پس جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی اپنے
عہد پہ قائم رہو اللہ متقین کو دوست رکھتا ہے۔ غرضیکہ آپ
کی پیش کردہ آیت میں صرف نقض عہد کرنے والوں سے قتال

کا حکم ہے نہ سارے عرب سے قتال کا حکم ہے نہ دنیا بھر
کے کفار سے ہے لہٰذا جب تمام کفار سے ہی قتال کا حکم نہیں
تو منافقین سے تو قتال کا حکم ہی نہیں آیا ورنہ نبیؐ ضرور
تعمیل کرتے۔ منافقین کے خاتمہ کے ثبوت میں مخاطب
محترم نے دو آیات قرآنی پیش کی ہیں :-

۱- یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین
واغلظ علیھم وماوٰھم جھنم وبئس
المصیر۔ " اے نبیؐ کفار و منافقین پر سختی کرو
اور ان کو سختی سے دباؤ۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے
جو بری جگہ ہے۔ یہ ایک آیت ہے جو دو جگہ آئی ہے۔
مخاطب محترم آیت مذکورہ سے لفظ جاہد دکھا کر یہ
تاثر دینا چاہتے ہیں کہ نبیؐ کو حکم تھا کہ تم کفار سے اور منافقین
سے قتال کرو۔ لہٰذا انھوں نے حکم خدا کی تعمیل کی اور کفار و
منافقین کو ختم کر دیا۔ ہمارے مخاطب نے اسلامی جہاد کے
فلسفہ قرآنی کو یا تو سمجھا ہی نہیں ہے یا دیدہ و دانستہ تجاہل

کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کفار سے بھی قتال کی اجازت نہیں دی جب تک وہ جنگ میں پہل نہ کریں

جس قتال کو ہمارے مخاطب اتنا سہل سمجھ رہے ہیں کہ ہر کافر و منافق کو صرف اس بناء پر کہ وہ کافر ہے یا منافق قتل کر دیا جائے قرآن اس کے سراسر خلاف ہے۔ قرآن کا اعلان عام ہے کہ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ دین کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرا واما کفورا۔ ہم نے راستہ دکھا دیا چاہے کوئی شاکر ہو جائے یا کافر ہے۔ من شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر جو چاہے وہ مومن ہو جو چاہے وہ کافر ہو۔ لست علیھم بمصیطر۔ اے رسولؐ تم ان پر داروغہ نہیں ہو ڈنڈے سے مار مار کر مومن بناؤ۔ سب سے پہلے اہل اسلام کو جو اذنِ قتال ملتا ہے اس کے الفاظ

قرآنی کو دیکھیے اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ۔ قتال کی اجازت دی جا رہی ہے ان کو جن سے قتال کیا جا رہا ہے۔ اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا جا رہا ہے اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ قتال کا یہ حکم ابتدائی اور بنیادی ہے جس میں قتال کی اجازت اس شرط پر دی جا رہی ہے کہ قتال کی پہل کفار سے ہو تو تم بھی ان سے قتال کرو۔ پھر دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے۔ قاتلوا الذین یقاتلونکم ان سے قتال کرو جو تم سے قتال کریں۔ وان لم یقاتلوکم فلا تقاتلوھم اگر وہ تم سے قتال نہ کریں تو تم بھی ان سے قتال مت کرو۔ کیا قرآن کریم کی آیات صریحہ یہ نہیں بتا رہی ہیں کہ محض کسی کا کافر یا منافق ہونا قتال کے لیے وجہ جواز نہیں ہے۔ جواز اس وقت ہوگا جبکہ وہ قتال کریں دوسروں کے لیے تو میں کچھ نہیں کہنا چاہتا لیکن نبی اور امام کا قتال جب بھی ہوگا ان ہی لوگوں سے ہوگا جو قتال میں پہل

کریں۔ جو لوگ کسی امام کے بارہ میں بھی یہ سوال کرتے ہیں کہ امامت
ان کا حق تھا تو منکرین امامت پر انھوں نے تلوار کیوں نہ اٹھائی
وہ آیاتِ قرآن میں اسکی وجہ ملاحظہ فرمالیں۔ نبی اور امام
سے جب تک قتال نہ کیا جائے وہ محض انکارِ نبوت و
امامت پر کسی سے قتال نہیں کرتے لیکن جب ان سے قتال
کیا جائے گا تو پھر ان کا ہاتھ نہ رکے گا۔ مقابلہ پر کوئی بھی ہو۔
خدا کی خدائی، نبی کی نبوت، امام کی امامت بزورِ شمشیر نہیں
منوائی جاتی اور اگر کسی کو بزور اور بجبر منواتا دیکھیں تو سمجھ
لیں کہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ چونکہ عہدِ نبیؐ میں منافقین
نے کبھی قتال کیا ہی نہیں اس لیے نبیؐ خلاف حکم خدا ان سے
کیسے قتال کرسکتے تھے اور یہ بات ہر بے عقل بھی سمجھ سکتا ہے
کہ منافق تو کہتے ہی اسکو ہیں جو اپنے کفر کو چھپائے ہوئے
ہو۔ لہٰذا منافق سے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ عہدِ نبیؐ میں نبیؐ سے
قتال کرکے اپنے چھپے ہوئے عقیدۂ انکارِ نبوت کو طشت
از بام کردے۔ وہ تو نبیؐ کے بعد بھی جب وارثِ نبیؐ سے قتال

کرے گا تو اس وقت بھی اپنے انکارِ نبوت کو ظاہر نہ ہونے دیگا
لہٰذا نہ منافقین نے نبیؐ سے قتال کیا نہ نبیؐ نے ان سے
کوئی جوابی قتال کیا۔ نبیؐ فتوحات کی غرض سے قتال کرنے
والے نہ تھے نہ محض اپنی نبوت کے انکار پر کسی کو قتل کرنے
والے تھے۔ وہ الٰہی قانون پر عامل تھے اور دوسروں کو عامل
بنانا چاہتے تھے۔ جو خود قانون کو پسِ پشت ڈال دے
وہ دوسروں کو قانون پر کیا چلا سکتا ہے؟

مخاطب محترم نے آیت یا ایھا النبیؐ جاھد
الکفار والمنافقین واغلظ علیھم کے سمجھنے اور
سمجھانے میں یہ غلطی فرمائی ہے کہ وہ لفظ جہاد اور لفظ قتال
کو مرادف اور بالکل ہم معنی سمجھ رہے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ ہر
جہاد قتال نہیں ہے بلکہ قتال صرف ایک قسم ہے جہاد کی۔
جہاد کے اقسام ہیں جو قتال کے علاوہ بھی ہیں منطقی اعتبار
سے یہ ہے کہ ہر قتال جہاد ہے لیکن ہر جہاد قتال نہیں ہے
جیسے ہر انسان حیوان ہے لیکن ہر حیوان انسان نہیں ہے

جہاد عام ہے اور قتال اسکی ایک خاص قسم ہے۔ محنت و
مشقت برداشت کرنا بھی جہاد ہے۔ کوشش بلیغ کرنا
بھی جہاد ہے کسی پر سختی اور تشدد کرنا بھی جہاد ہے اور قتال
کرنا بھی جہاد ہے۔ جو کام انسان بلیغ کوشش اور جانفشانی
سے کرتا ہے اسکو کہا جاتا ہے کہ اس نے بڑا جہاد کیا ہے
لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بڑا قتال کیا ہے؛ چنانچہ والدین
کے بارہ میں فرمایا جاتا ہے وان جاھداک علیٰ ان تشرک
بی ما لیس لک بہ علم فلا تطعھما۔ اگر تیرے
والدین تجھ پر یہ سختی کریں کہ تو شرک اختیار کرے تو ان کی
اطاعت نہ کر (سورۂ لقمان) یہاں لفظ جہاد موجود ہے
مگر اس کے معنیٰ قتال کے ہرگز نہیں۔ جہاد بالقلم بھی ہے
جہاد باللسان بھی ہے۔ جہاد بالمال بھی ہے اور جہاد بالسیف
بھی ہے۔ لیکن قتال بالقلم، باللسان، بالمال نہیں۔ جس
طرح وان جاھداک علیٰ ان تشرک میں جہاد
سختی کرنے کے معنیٰ میں آیا ہے بالکل اسی طرح جاھد

الکفار والمنافقین میں جہاد سختی کرنے کے معنیٰ میں
آیا ہے جس کے معنیٰ ہیں کہ اے نبیؐ کفار اور منافقین کو
سختی سے دباؤ کہ وہ شتر بے مہار ہو کر تبلیغ دین میں روڑے
نہ اٹکائیں اور امن میں خلل انداز نہ ہوں۔ ورنہ قتال کی
شرط قرآن کریم نے جا بجا یہ بیان کر ہی دی ہے کہ
جب قتال میں کوئی پہل کرے اسوقت قتال کیا جائے۔ جو
قتال کرے اس سے قتال کرو۔ جو قتال نہ کرے اس
سے قتال نہ کرو۔ یہاں نکتہ رس حضرات کے لیے ایک
نکتہ بیان کیا جاتا ہے۔ دنیائے اسلام کو معلوم ہے کہ
نبیؐ غزوات میں تشریف لے جاتے تھے، شمشیر بکف بھی
رہتے تھے لیکن چونکہ آپ نبئ رحمتؐ تھے خود سے آنحضور
کسی کافر کے مقابلہ میں نہیں آئے نہ کسی سے نبرد آزما ہوئے
لہٰذا قتال آپ کا کام نہ تھا۔ یہ کارِ امت تھا۔ یہی وجہ ہے
کہ قرآن کریم نے سوائے ایک بدر صغریٰ کے موقع کے
(جبکہ مسلمان قتال سے ہچکچا رہے تھے مسلمانوں کو غیرت

دلانے کے لیے تنہا نبیؐ کو حکمِ قتال دیا۔ لیکن مسلمانوں کو غیرت
آئی اور نبیؐ کے تنہا قتال کرنے کی نوبت نہیں آئی) ہر
جگہ عموماً حکمِ قتال، اذنِ قتال، مدح قتال صیغۂ جمع میں
بیان فرمایا ہے۔ صرف نبیؐ سے خطاب کرکے صیغۂ واحد
میں قاتِلْ / اُقتُلْ نہیں فرمایا۔ ہم چند مثالیں پیش
کرتے ہیں:-

۱۔ اُذِنَ للذین یقاتلون الخ۔ قتال کی اجازت
دی جارہی ہے ان لوگوں کو جن سے قتال کیا جارہا
ہے۔ صیغۂ جمع ہے۔ یہ نہیں کہ نبیؐ کو اجازت
ہے جس سے کہ قتال کیا جارہا ہے۔

۲۔ فقاتلوا ائمۃ الکفر۔ تم لوگ کفر کے سرداروں
سے قتال کرو۔ صیغۂ جمع میں حکم ہے۔ یہ نہیں کہ
اے نبیؐ تم کفار کے سرداروں سے قتال کرو۔

۳۔ قاتلوا المشرکین حیث وجدتموھم۔
تم لوگ مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ صیغۂ جمع

میں حکم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اے نبیؐ تم مشرکین
کو قتل کرو۔

۴۔ قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ۔ تم لوگ
قتال کرو اللہ کے نہ ماننے والوں سے۔ صیغۂ جمع
میں حکم ہے۔ یہ نہیں کہ اے نبیؐ تم مشرکین کو قتل
کرو۔

۵۔ قاتلوا المشرکین کافّۃ کما یقاتلونکم
کافّۃ۔ تم سب مل کر مشرکین سے قتال کرو۔
جیسے وہ مل کر تم سے قتال کرتے ہیں۔ وہی صیغۂ
جمع میں حکم ہے۔

۶۔ ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم
واموالھم بانّ لھم الجنۃ یُقاتِلُونَ فی
سَبِیلِ اللہِ فَیَقتُلُونَ ویُقتَلُونَ ۰ مومنین
جن کے جان و مال کو اللہ نے خریدا وہ راہِ خدا
میں قتال کرتے ہیں۔ وہ قتل کرتے ہیں اور قتل کر

دیے جاتے ہیں۔ سب جمع کے صیغے ہیں۔

۷۔ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا الخ۔ اللہ محبت رکھتا ہے ان سے جو اسکی راہ میں پرا باندھ کر ثابت قدمی سے قتال کرتے ہیں۔ وہی جمع کا صیغہ ہے۔

۸۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ۔ اے ایمان والو ان کفار سے قتال کرو جو (چڑھ کر) تمہارے پاس پہنچ جائیں۔

۹۔ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا۔ اور تم لوگ اللہ کی راہ میں ان سے قتال کرو جو تم سے قتال کریں اور تم (اپنی طرف سے پہل کرکے) زیادتی نہ کرو۔

۱۰۔ واقتلوهم حيث ثقفتموهم۔ تم لوگ ان کو جہاں پاؤ قتل کرو۔

۱۱۔ ولا تقاتلوهم عند المسجد الحرام حتى يقاتلوكم فيه فان قاتلوكم فاقتلوهم

"تم لوگ کفار سے مسجد الحرام کے قریب قتال نہ کرو جب تک کہ وہ حرم میں تم سے قتال نہ کریں اگر وہ تم سے قتال کریں تو پھر تم بھی بے شک ان کو قتل کرو۔ امر و نہی کے سب صیغے جمع کے ہیں۔

آیاتِ قرآنیہ کی مثالیں صاف بتا رہی ہیں کہ قتال بنفسِ نفیس نبیؐ کا کام نہیں بلکہ مجموعی امت کا فرض ہے لہٰذا اگر یا ایہا النبی جاھد الکفار والمنافقین میں جہاد سے مراد قتال ہوتا تو یہ حکم بھی عام افرادِ امت کے نام صیغۂ جمع میں ہوتا۔ لیکن اس آیت میں تنہا نبیؐ کو پکارا گیا ہے اور تنہا نبیؐ سے جاہِدْ "جہاد کر" کہا جا رہا ہے۔ جاہِدُوا جمع حاضر کا صیغہ نہیں ہے۔ بلکہ جاہِدْ واحد امر حاضر کا صیغہ ہے۔ یہ حکم تنہا نبیؐ کو دیا جا رہا ہے۔ یہ قتال کا حکم نہیں ہے بلکہ کوشش اور سختی سے کفار اور منافقین کو دبانے کا حکم دیا

گیا ہے۔ لہٰذا نبیؐ نے منافقین سے کوئی قتال نہیں کیا۔ کیونکہ منافقین نے کوئی قتال کیا ہی نہ تھا نہ منافقین کو یہ موقع تھا کہ وہ نبیؐ سے یا مسلمانوں سے کوئی قتال کرکے اپنے مخفی نفاق کو آشکارا کر دیں۔ اب رہے کفار، نبیؐ نے ان سے بھی کبھی کوئی قتال نہیں کیا جب تک کفار نے قتال میں سبقت نہیں کی۔

اب دوسری آیت دیکھیے جس کو مخاطبِ محترم نے پیش کرکے منافقین کا عہدِ پیغمبرؐ میں ختم ہو جانا دکھایا ہے۔

لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا مَلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔

"اگر منافقین اور مدینہ میں غلط خبریں پھیلانے والے اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے۔ یہ لوگ باز نہ آئے

تو ہم اے نبیؐ تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔ پھر وہ تمہارے پاس پڑوس زیادہ نہ رہنے پائیں گے۔ یہ پھٹکار مارے جہاں جائیں گے پکڑے جائیں گے اور اچھی طرح قتل کیے جائیں گے۔ یہ وہ اللہ کی سنّت ہے جو پہلے لوگوں کے بارہ میں بھی رہی ہے اور اللہ کی سنّت کبھی نہ بدلے گی۔"

ہمارے مخاطب نے اس آیت سے یہ دکھایا ہے کہ خداوندِ عالم نے اپنے نبیؐ کو حکم دے دیا کہ یہ منافق اگر مومن نہ ہوں اور اپنی منافقت کو نہ چھوڑیں تو تم ان کو قتل کر دو چونکہ مخاطب کے نزدیک اللہ کا یہ حکم آگیا تھا لہٰذا رسولؐ نے تمام منافقین کو قتل کر دیا اور کوئی ایک منافق بھی باقی نہ رہا۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کہ منافقین کو صرف اس جرم میں کہ وہ منافق کیوں ہیں مومن کیوں نہیں ہوتے، قتل کر دو۔ دین کے بارہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہے۔ کافر ہو یا منافق ہم دکھا چکے ہیں کہ جب تک یہ قتال نہ کریں ان کو کافر یا منافق ہونے کی بنا پر قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اب؛

میں اس آیت کا صحیح مقام دکھاتا ہوں۔ آیت میں یہ لفظ ہے کہ اگر منافقین وغیرہ باز نہ آئے تو اے نبیؐ ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔ یہاں دو چیزوں کو دیکھنا ہے۔ ایک یہ کہ منافقین کا ہے سے اور کس بات سے باز نہ آئے؟ دوسرے یہ کہ ہم اے نبیؐ تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے پھر وہ تمھارے پاس نہ رہ سکیں گے۔ یہاں پیچھے لگا دینے سے اور تمھارے پاس نہ رہ سکنے سے کیا مطلب ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ یہ منافقین وغیرہم مسلمان مستورات سے جبکہ وہ رفع حاجت وغیرہ کے لیے باہر نکلتی تھیں چھیڑ خانی کرتے تھے اور ان پر فقرے کستے تھے۔ ان کی بے دینی اور منافقت کو تو برداشت کیا جاسکتا تھا لیکن یہ طرزِ عمل لائقِ برداشت نہ تھا اس لیے اللہ تعالےٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا کہ یہ منافقین وغیرہم اگر اپنے حرکات سے باز نہ آئے تو ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے پھر یہ تمھارے قرب و جوار میں نہ رہنے پائیں گے۔ یعنی ہم تم کو حکم دے دیں

گے کہ ان کو مسلمان آبادیوں سے نکال دو اور شہر بدر کر دو یہ مسلمان آبادیوں سے (نکالے جانے کے بعد) جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور قتل کیے جائیں گے یہ شہر بدر کرنے اور نکال باہر کیے جانے کی وہ سنتِ الہٰی ہے جو پہلے بھی رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ میرے پاس قرآنِ کریم مترجم ترجمہ اردو از امام المحدثین مقتدار المفسرین شاہ رفیع الدین صاحب وبرحاشیہ فوائد موضح القرآن از حضرت شاہ عبدالقادر صاحب موجود ہے جس کو شیخ برکت علی غلام علی تاجر کتب لاہور نے چھاپا ہے۔ اس آیت کے بارہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"جو لوگ بدنیت تھے۔ مدینہ میں عورتوں کو چھیڑتے، ٹوکتے اور جھوٹی خبریں اڑاتے تھے، مخالفوں کے زور کی اور مسلمانوں کے بیچ کی، ان کو یہ فرمایا اور توراۃ میں بھی تقید ہے کہ مفسدوں کو اپنے بیچ

میں سے باہر کردو۔"

آیتِ مذکورہ لئن لم ینتہ المنافقون الخ سے ملی ہوئی پہلے کی آیت، خود بھی اس چیز کو صاف کر رہی ہے کہ ان لوگوں کی مستورات سے چھیڑ خانی کرنے پر یہ آیت آئی ہے۔ وہ یہ ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ الخ

"اے نبیؐ اپنی ازواج سے اور اپنی بیٹی نواسیوں سے اور مومنین کی مستورات سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی بڑی چادریں اپنے آپ سے ملائے رکھیں۔ اس طرح ان کی پہچان ہوتی رہے گی (کہ یہ شریفہ ہیں آوارہ نہیں ہیں) پھر ان کو نہ ستایا جائے گا (گزشتہ کے لیے) اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ہاں اگر منافقین وغیرہم (اب بھی) باز نہ آئیں گے تو اے نبیؐ ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے پھر وہ تمہارے قرب و جوار میں زیادہ نہ رہنے پائیں گے۔ یہ پھٹکار مارے (مسلمانوں کی آبادی میں) جہاں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور اچھی طرح قتل کر دیے جائیں گے کہ ممنوعہ علاقہ میں کیوں داخل ہوئے۔ یہی شہر بدر کرنے کا ہمارا وہ قانون ہے جو پہلے زمانہ میں تھا اور ہمیشہ رہے گا۔"

یہ ہے مذکورہ آیت کا صحیح نقشہ جس کو ہمارے مخاطب نے مشق ستم کر کے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ ورنہ منافقین کو قتل کیا گیا نہ کہیں ان کی صفائی ہوئی۔ ہم نے آیۂ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ کے ترجمہ میں بیٹی، نواسیاں ازروئے قرآن لکھا ہے کیونکہ مسلمانوں کا بلا کسی اختلاف کے اس پر اجماع ہے کہ انسان پر بیٹی، پوتی، نواسی، پرپوتی، پرنواسی سب حرام ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ خود اپنی بیٹیاں حرام ہیں مگر

بیٹی یا بیٹے کی بیٹی حرام نہیں ہیں۔ قرآن کریم نے بیٹی
پوتی، نواسی، پرپوتی اور پر نواسی اور آئندہ تمام نسلوں کو
سب کو بنات کہا ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ
وَبَنَاتُكُمْ۔ پوتی، نواسی اور ان کی نسل سے پیدا ہونے
والیوں کو بنات کے سوا اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کیا۔
چونکہ یہ حکم خدا کہ رسولؐ اپنی ازواج، بنات اور زنانِ
مومنین سے کہہ دو، صرف آیت کے نزول ہی کے وقت
کے لیے نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ یہ حکم ان ازواج
کے لیے بھی ہے جو اس وقت تھیں اور ان کے لیے بھی ہے
جو آئندہ زوجیت میں آئیں۔ اس بیٹی کے لیے بھی ہے
جو اس وقت تھیں اور بالغہ تھیں اور ان نواسیوں کے
لیے بھی ہے جو آئندہ سن تمیز کو پہنچیں یا قیامت تک نبویؐ
نسل سے پیدا ہوں۔ ان زنانِ مومنین کے لیے بھی ہے
جو اس وقت موجود تھیں اور بڑی تھیں اور ان زنانِ
مومنین کے لیے بھی ہے جو ابھی چھوٹی ہیں آئندہ بڑی ہونگی

یا پیدا ہوں گی۔ جو لوگ اس آیت کے لفظ بنات سے
نبیؐ کی کئی بیٹیاں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ
اس کو غور سے پڑھیں اور وہ حضرات یا تو یہ کہہ دیں کہ دادا
اپنی پوتی سے اور نانا اپنی نواسی سے نکاح کرسکتا ہے یا
یہ دکھائیں کہ پوتی، نواسی کا حرام ہونا قرآن کریم نے
بنات کے علاوہ کسی اور لفظ میں بیان کیا ہے۔ اسی
طرح جو لوگ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے ابناء رسولؐ
(فرزندانِ رسولؐ) ہونے سے انکار کرنا چاہتے ہیں وہ
حضرات یا تو یہ کہدیں کہ نانا اپنے نواسہ کی زوجہ سے نکاح
کرسکتا ہے یا یہ دکھائیں کہ قرآنِ کریم نے نواسہ کی زوجہ
کا حرام ہونا وحلائل ابنائکم الذین من
اصلابکم (اور حرام ہیں تم پر تمہارے ان بیٹوں
کی بی بیاں جو تمہارے اصلاب سے ہوں) کے علاوہ
کسی اور لفظ میں بیان کیا ہے۔ آنحضورؐ پر امام حسنؑ اور
امام حسینؑ کی بیٹیاں اسی لیے تو حرام ہیں کہ وہ بھی بنات

رسولؐ ہیں تو جب حسنؑ و حسینؑ کی بیٹی رسولؐ کی بیٹی ہے
تو حسنؑ و حسینؑ رسولؐ کے بیٹے نہ ہوئے؟ اسی طرح امام حسنؑ
اور امام حسینؑ کی ازواج آنحضورؐ پر اس ہی لیے تو حرام
ہیں کہ وہ از روئے قرآن حلائل ابنائکم ابناءِ رسولؐ
کی ازواج ہیں۔ یاد رکھیے کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ تو
کیوں نہ ابناءِ رسولؐ ہوتے قرآن مجید تو فاطمہ زہراؑ کی
نسل سے قیامت تک پیدا ہونے والے مردوں کو ابناءِ
رسولؐ کہہ رہا ہے اور قیامت تک پیدا ہونے والی عورتوں
کو بناتِ رسولؐ کہہ رہا ہے۔ البتہ ساداتِ اور امام حسنؑ و
حسینؑ و فاطمہ زہراؑ میں جو بڑا فرق ہے وہ یہ ہے کہ سادات
اولادِ رسولؐ ہیں اور سادات کو رسولؐ سے رشتہ ہے
مگر نبوت اور رسالت سے رشتہ نہیں۔ ائمہ اہل بیتؑ
اور خاتونِ جنت کو نبی اور رسولؐ سے بھی رشتہ ہے اور
اس کے ساتھ نبوت اور رسالت سے بھی کیونکہ وہ حضرات
اہل بیتِ نبیؐ بھی ہیں اور اہلِ بیتِ نبوت بھی۔ اہل بیت

رسولؐ بھی ہیں اور معدنِ رسالت بھی۔

میرے مخاطبِ محترم نے پورا زور اسی پر لگایا تھا
کہ اللہ تعالےٰ نے نبیؐ کو حکم دیا تھا کہ کفار و منافقین تم
سے قتال نہ بھی کریں ان کو بیٹھے بٹھائے بھی قتل کردو صرف
اس لیے کہ وہ کفار اور منافقین ہیں۔ کیوں میں قرآن کریم
سے دکھا چکا کہ نبیؐ اور امامؑ قتال کرنے والے سے قتال
کرتا ہے ورنہ ہرگز قتال نہیں کرتا۔ لاکھ کوئی نبوت اور
امامت کا منکر ہو۔ قرآن مجید صاف کہہ رہا ہے
کہ جب تک یہ لوگ قتال نہ کریں تم ان کی اذیت رسانی
کو برداشت کرتے رہو۔ چنانچہ آیۂ مذکورہ لئن لم
ینتہِ المنافقون سے کچھ پہلے اسی سورۂ احزاب
میں نبیؐ سے ارشاد ہوتا ہے :-

ولا تطع الکافرین والمنافقین ودع
اذٰہم وتوکل علی اللہ وکفیٰ باللہ وکیلا۔
"اے نبیؐ! کفار و منافقین کی اطاعت تو کبھی نہ

کرنا، البتہ جو اذیت کفار و منافقین پہنچائیں اس کو
نظر انداز کرو، چھوڑ دو اور اللہ پر بھروسہ رکھو وہ بہترین
سپرد دار ہے۔"

کہیے، آیت میں کفار و منافقین کو خواہ مخواہ بھی
قتل کر دو" یہ حکم ہے یا یہ ہے کہ ان کی اذیت دہی کو
کو بھی نظر انداز کر دو، چھوڑ دو۔ یہاں قتال کرنے کا حکم ہے
یا نہ کرنے کا ہے۔ اسی طرح سورۂ نساء میں فرمایا جاتا ہے اور
ذکر ہے منافقین کا۔ وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا
بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ
الَّذِي تَقُولُ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ فَأَعْرِضْ
عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ وَكِيلًا
(منافقین تمہارے سامنے تو) کہتے ہیں کہ آپ کا حکم بسرو
چشم منظور ہے مگر جب تمہارے پاس سے نکل کر جاتے
ہیں تو کچھ لوگ ان میں سے کچھ اور صلاح مشورے کرتے ہیں
اور تمہاری بات کو پلٹ دیتے ہیں۔ اللہ ان کے اس

صلاح مشورہ کو لکھ رہا ہے۔ اے رسولؐ تم ان لوگوں سے
چشم پوشی کرو اور اللہ پر توکل رکھو۔ اللہ تمہاری مدد اور
حمایت کے لیے کافی ہے۔ کہیے اس آیت میں منافقین
کو مار ڈالنے کا حکم ہے یا ان کو طرح دینے اور چشم پوشی
کا ہے۔

مخاطب محترم نے فرمایا تھا کہ:-

"جو لوگ صحابہ میں منافقوں کا وجود تسلیم
کرتے ہیں انھیں معاذ اللہ معاذ اللہ حضورؐ
کی نبوت کی فکر ہونا چاہیے۔ کیونکہ $\frac{۹}{۷۳}$ اور
$\frac{۶۶}{۹}$ میں منافقوں کا خاتمہ فریضۂ نبوت
بتایا گیا ہے۔" (تحفظ ناموس صحابہ نمبر ص۵۴)

میں یہ کہتا ہوں کہ جو لوگ منافقوں کا قتل عام تجویز
کرکے منافقوں کا خاتمہ دکھانا چاہتے ہیں ان کو نبوت کی
فکر ہونا چاہیے۔ کیونکہ قرآن منافقوں کے قتل عام سے
نبیؐ کو دع اذاھم، فاعرض عنھم کہہ کر روک رہا

سے اور تنہا منافقین ہی کے قتلِ عام سے نہیں بلکہ وہ کفار کے قتلِ عام سے بھی ذَرۡ ھُمۡ اَذَاھُمۡ کہہ کر روک رہا ہے مگر اس وقت جبکہ وہ قتال کریں۔

مخاطبِ محترم فرماتے ہیں :-

"اور یہ خلافت کے جھگڑے اور قلم دوات کے شاخسانے سب نام نہاد احادیث اور نام نہاد تاریخ کی صورت میں دشمنانِ اسلام کے گھڑے کیے ہوئے ہیں۔"

— دشمنانِ اسلام تو آپ کے نزدیک حیاتِ نبیؐ ہی میں سب ختم ہو گئے تھے۔ یہ پھر کیسے زندہ ہو گئے؟ کہ کوئی اسلام دوست ہی نہ رہا جس کے پاس زبان، قلم، حکومت ہوتی اور وہ ان اغلاط کی تردید کرتا۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو دشمنانِ اسلام کہنا یہ کام کسی اسلام دوست کا نہیں بلکہ دشمنِ اسلام ہی کا ہو سکتا ہے۔

ہمارے مخاطبِ جلیل کو "صحابیت کا قرآنی تصور" میں جا بجا تضاد نظر آتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

اور اس سلسلہ میں تضاد کی یہ حد ہے کہ (صفین میں امیر المومنینؑ سے لڑنے والوں کو) کبھی تو انھیں مسلمان تسلیم کرتے ہیں اور کبھی منافق ٹھہرانے کی کوشش فرماتے ہیں، جیسے کہ کتابچہ (صحابیت کا قرآنی تصور) کے ص ۴۷ پر فتحِ مکہ سے پہلے ایمان لانے والوں اور بعد میں ایمان لانے والوں کے مدارج عیاں کرتے ہوئے آیتِ ذیل کو خود پیش کر بیٹھے ہیں جس نے فتح سے پہلے اور بعد والے سب ایمان والوں کو خود آپ کے قلم سے حقیقی سچے مومن منوا لیا ہے۔

مخاطبِ محترم کی یہ باتیں اتنی پریشان ہیں جو ان کی ذہنی پریشانی کا آئینہ ہیں۔ بقول مخاطب جب میں کسی جماعت کو منافقین سمجھتا ہوں اور منافقین ٹھہرانے کی کوشش کر رہا ہوں تو میں اسکو مسلمان کیسے تسلیم کر سکتا

ہوں اور مسلمان تسلیم کرلوں تو منافق کیسے ٹھہرا سکتا ہوں
لیکن کسی منافق کے لیے بر سبیلِ تذکرہ اگر لفظ مسلمان
یا لفظ مومن محض اس کے دعوے کی بنا پر کہا جائے اور پھر
تنقید کرتے ہوئے اسکو غیر مسلم ثابت کیا جائے تو ہر شخص
جانتا ہے کہ یہ تضاد نہیں ہے۔ میں پہلے دکھا چکا ہوں
کہ قرآنِ کریم نے بھی ان کو اپنے دعوے کی بنا پر مومن و
مسلم کہا ہے لیکن حقیقت کی بنا پر ومٰا ھم بمؤمنین
بھی کہا ہے تو کیا قرآن کریم میں بھی تضاد ہے۔ امام حسینؑ
سے جن لوگوں نے جنگ کی وہ کون تھے؟ ہر شخص کہے گا مسلمان
حضرت عثمان کے قاتل کون تھے؟ مسلمان۔ قاتلِ علی مرتضیٰؑ
کون تھا؟ مسلمان! جنگِ احد سے جنھوں نے فرار کیا، جو
حنین سے بھاگے کون تھے؟ مسلمان: رسولؐ کو کان
کہنے والے کون تھے؟ مسلمان تقسیمِ صدقات پر رسولؐ
کو ناانصاف کہنے والے کون تھے؟ مسلمان! اب اگر
تنقید کسی کے لیے یہ ثابت کر دے کہ وہ مسلمان نہ تھا

تو یہ تضاد نہیں۔ لفظ مسلمان بحسبِ ظاہر کہنا کوئی گناہ یا
غلط بات تو نہیں مسلمان تو مسلمان آپ تو ان میں بہت سوں
کو صحابہ فرما رہے ہیں میرے خیال میں جس بدنصیب نے
رنگیلا رسول لکھا تھا آپ اس کو جواب دیتے تو یہ کہتے
کہ تیری کتاب کے نام ہی میں تضاد ہے کیونکہ تو رسول بھی
مان رہا ہے اور رنگیلا بھی کہہ رہا ہے حالانکہ اس کے نام میں
رسول اس کے عقیدہ کا لفظ نہیں۔ اس نے رسول کا لفظ
رسول مان کر نہیں لکھا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے
آپ کو رسول کہتے تھے وہ معاذ اللہ رنگیلے تھے۔ قرآنِ کریم
میں مذکور ہے کہ ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو۔ پھر
فرمایا کہ ابلیس نے سجدہ سے انکار کر دیا وہ ایک جن تھا۔
آپ تو یہاں فوراً کہہ دیں گے کہ تضاد ہے۔ کہیں اس کو
منجملہ ملائکہ قرار دیا کہیں اس کو جن کہہ دیا۔ حالانکہ منجملہ ملائکہ
اس کو قرار دیا گیا۔ اس کے ملائکہ میں شامل ہونے کی بنا پر
اور جن فرمایا اسکی حقیقت کی بنا پر۔ ہم لوگ شاید ہر بیچارا

نظریہ آپ کو معلوم ہے مگر واقعات کے ذکر میں برابر یہی
کہتے ہیں کہ یہ واقعہ خلیفۂ اوّل کے زمانہ کا ہے اور فلاں
واقعہ خلیفۂ ثانی کے عہد کا ہے تو کیا یہاں بھی آپ فرما
دیں گے کہ تم نے خلیفۂ اول اور خلیفۂ ثانی کہہ کر ہمارا عقیدہ
قبول کر لیا اب تم شیعہ نہیں ہو۔

میں نے نہ فتح مکہ سے پہلے ایمان والوں کو سب کو
مومن مانا ہے نہ بعد والوں کو سب کو مومن مانا ہے۔ پہلے
والوں میں بھی مومن اور غیر مومن کا اختلاط تھا تو بعد والوں
میں کیوں نہ ہوتا۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ بعد والے ہزار مومن ہوں
لیکن پہلے والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جس کا مطلب صرف
یہ ہے کہ بعد والے اگر حقیقتاً مومن ہوں بھی تب بھی وہ
پہلے والے حقیقی مومنین کی از روئے قرآن برابری نہیں کر
سکتے چہ جائیکہ جو بھی بعد کا کوئی اور ایمان بھی ہو حفاظت
جان کے لیے۔ خداوند عالم نے تو سندِ ایمان کل مہاجرین و
انصار کو بھی نہیں عطا کی بلکہ بعض کو دی ہے۔ السابقون

الاولون من المہاجرین والانصار میں تبعیض
کا من موجود ہے جن کے لیے رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ فرمایا
ہے۔ والذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی
سبیل اللہ والذین آووا ونصروا اولٰئک ھم
المومنون حقاً۔

"جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور
خدا کی راہ میں جہاد کیا اور وہ جنھوں نے جگہ دی اور نصرت کی
وہ لوگ سچے مومن ہیں۔"

ایمان کی حقیقت تو خدا ہی جانتا ہے لیکن یہاں آمنوا
سے مراد صدقِ دل ہی سے ایمان لانا ہے۔ ہجرت میں بھی نیت
تقربِ الٰہی ضروری ہے جس کا ہم ادراک نہیں کر سکتے
اب رہا جاھدوا فی سبیل اللہ یہ ہے عمل جس کا ادراک
ہو سکتا ہے۔ جاھدوا فی سبیل اللہ کا معیار
تولوا منکم ولیتم مدبرین، عصیتم
اور اذ تصعدون ولا تلوٗن کی موجودگی میں ختم ہو

جاتا ہے۔ اسی بنا پر میں برابر یہ کہتا چلا آرہا ہوں کہ ایسے
لوگوں کو صحابہ کہہ کر صحابہ کی توہین نہ کیجیے۔ دوسری
آیت دیکھیے

ثم انّ ربّک للذین ھاجروا من بعد
ما فُتِنوا ثمّ جاھدوا وصبروا انّ ربّک من
بعدھا لغفورٌ رحیم ہ

"پھر اے رسولؐ تمھارا رب ان کے لیے ہے جنھوں
نے ہجرت کی مصیبت زدہ ہونے کے بعد (یہاں سے
فتح مکہ کے بعد کے مدینہ آنے والے نکل گئے) پھر انھوں
نے جہاد کیا اور صبر کیا تو تمھارا رب ان شرطوں کے بعد
ضرور بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

جاھدوا کے بالکل ساتھ ہے صبروا، جس
کے معنی یہ ہیں کہ صبر کے ساتھ میدان جنگ میں ٹھہریں۔
ظاہر ہے کہ جنگ سے فرار صبر نہیں ہے بے صبری ہے۔
اس سے صاف عیاں ہے کہ فتح مکہ سے پہلے والے مسلمان

بھی کُل کے کُل مومن نہیں بلکہ مہاجرین و انصار کے لیے بھی)
محض لفظ مہاجرین اور لفظ انصار کوئی سندِ ایمان نہیں تو
بعد فتح مکہ والے مذکورہ شرائط کے بغیر کیسے مومن ہو سکتے
ہیں؟ اللہ نے جو پہلے والوں اور بعد والوں سے ہر ایک سے
اچھی جزا کا وعدہ کیا ہے وہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے۔
لیکن یہ وعدہ ہر زمانہ کے حقیقی مومن سے ہے۔ تمام کنج اور
کہنے کے مومن سے نہیں ہے۔ اچھی جزا کی بنیاد تو ایمان ہے
فتح مکہ کے بعد صرف وہی لوگ تو ایمان نہیں لائے جو اب
تک نبیؐ سے برابر جنگ کرتے رہے تھے۔ فتح مکہ کے
بعد تو دیار و امصار کے لوگ فوج فوج ہو کر اللہ کے دین
میں داخل ہوئے۔ ان میں جو لوگ صدق دل سے ایمان
اور وہ اپنی آخری زندگی تک مستقیم بھی رہے ان کو اچھی جزاء
کیوں نہ ملے گی۔ قرآن مجید نے ایمانِ صادق کے بعد
استقامت کی بھی شرط لگائی ہے۔ الّذین قالوا ربّنا
اللہ ثمّ استقاموا فلا خوف علیھم ولا ھم

یحزنون۔" جنھوں نے (دل سے) کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ ہمیشہ (راہِ حق پر) ثابت قدم رہے نہ ان پر خوف ہوگا نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔" ایسے حضرات کے لیے ارشادِ الٰہی ہے۔ وکلاً وعد اللہ الحسنیٰ ہر ایک سے اللہ نے اچھی جزا کا وعدہ کیا ہے۔ اگر ایمان ہی نہیں یا ایمان کے بعد استقامت ہی نہیں تو کیسا اگلا اور کیسا پچھلا۔

ہم نے اپنی کتاب "صحابیت کا قرآنی تصور" میں تحریر کیا تھا کہ "سب ہی مومنین نے راہِ فرار اختیار نہ کی تھی"۔ کسی جگہ ہم نے لکھا تھا، اس جماعت (کفار) نے مسلمانوں پر اچانک حملہ کیا تو بنا بنایا کام بگڑ گیا مسلمان اس حملہ کی تاب نہ لا سکے۔ ادھر ادھر چلے گئے۔ (خط کشیدہ ہمارے الفاظ پہ مخاطب محترم معترض ہیں کہ تم تو خود ان کو مسلمان اور مومن کہہ رہے ہو، اس طرح تم نے ان کو مسلمان اور مومن مان لیا۔ بھائی جان! کہنا اور بات

ہے اور ماننا اور بات ہے جیسے کسی کا نام رستم رکھ دیا جائے اس کو رستم کہنا صرف کہنا ہے، یہ ماننا نہیں ہے۔ صادق نامی کو صادق کہنا اس کو صادق ماننا نہیں ہے۔ جو مسلمان کہلاتا ہو اس کا تذکرہ لفظ مسلمان ہی سے ہوگا۔ ہمارے مخاطبِ عزیز نے خصوصیت سے ہم سے سوال کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ہم اپنے محترم مقالہ نگار سے عرض کرتے ہیں کہ یہ کیا تضاد ہے کہ آپ لکھتے ہیں بھاری پیٹ والے اور چھپے رستم لیکن آپ کی حمائل شریف سید مقبول احمد صاحب کے ص۳۷ پر یخوفونک ۳۹/۳۶ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اے رسولؐ وہ تم سے صاف کہتے ہیں کہ علیؑ کو خلیفہ نہ بنایئے اس سے ہمیں معاف رکھیے اور تم کو دھمکی دیتے ہیں کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم کفار سے جا ملیں گے۔ ایک طرف چھپے رستم اور دوسری

طرف صاف صاف کہتے ہیں۔"

— جناب والا، تضاد تو اس وقت ہوتا جب ہم
نے تمام منافقین کو بھاری پیٹ والا اور پچھے رستم کہا
ہوتا۔ ہمارے کتابچہ کے الفاظ تو ہیں کہ ان منافقین میں
سے کچھ تو ایسے اوچھے اور ہلکے پیٹ کے تھے جو اپنے راز
نفاق کو چھپائے رکھنے سے بعض اوقات بے بس ہو
جاتے تھے اور ایسے حرکات کر بیٹھتے تھے جن سے ان کی
منافقت کا راز کھل جاتا تھا اور مومن سمجھ جاتے تھے
کہ یہ لوگ منافقین ہیں، لیکن کچھ منافقین ایسے محتاط اور
بھاری پیٹ کے تھے جو کسی طرح اپنے نفاق کی ہوا
بھی کسی کو نہ دیتے تھے۔ جب ہم از روئے قرآن دو طرح
کے منافق دکھا چکے ہیں تو مولوی مقبول احمد صاحب نے
جن کا ذکر کیا ہے اور خود آپ نے بھی سیاہ نشان لگا
لگا کر جن منافقین کی علامات کو بیان کیا ہے۔ یہ وہی
اوچھے پیٹے والے ہوئے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"قرآنِ کریم میں منافق کا مستقل نشان
بتایا گیا ہے کہ وہ جنگ سے بھاگتا ہے۔"

— اللہ نے کلمۂ حق آپ سے کہلا ہی لیا۔ یہی تو میں
بھی کہہ رہا ہوں، بے شک یہ نشان مستقل ہے۔ ہر جگہ
انسان تصنع کر سکتا ہے مگر تصنع میں جان نہیں دے
سکتا۔ اس لیے یہ نشان بے خطا ہے لیکن آپ کے
تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر ص ۶۰ و ۶۱ پر تو ایسے تمام لوگوں کو
حقّے سچے مومن اور صحابہ ثابت کیا گیا ہے بلکہ بقول مخاطب
ان کے محاسن و مکارم کو بھی قرآن نے نظر انداز نہیں کیا۔
آپ نے تو ان کے بھاگنے کو سہواً یا بلا ارادہ قرار دے کر
ان کی خطاء کو بعض انبیاء کے ترکِ اولیٰ سے ملا دیا تھا۔ اب
آپ ان کو کھل کر منافق فرما رہے ہیں۔ یہ تضاد تو نہیں ہے؟
اب ہم کو یہ پوچھنا پڑا کہ منافق کا جو مستقل نشان ہے کہ
وہ جنگ سے بھاگتا ہے اس سے آپ کی مراد کیا ہے؟
منافق وہ ہے جو جنگ میں جانے سے بھاگتا ہے یا وہ بھی

جو جنگ میں جاکر بھاگتا ہے۔ اگر صرف وہ ہے جو جنگ
میں جانے سے بھاگتا ہے اور وہ نہیں ہے جو جنگ میں
جاکر بھاگتا ہے تو یہ کیوں؟ کیا اس لیے کہ یہ میدانِ جنگ
تک آ تو گیا ہے۔ اب ٹھہرے یا نہ ٹھہرے اس سے اسکی
مومنیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو اللہ کا مطلب یہ تھا تم مومن
ہو تو جنگ میں چلے جاؤ، پھر چاہے کچھ دیر ٹہل ٹہلا کر چلے
ہی آنا، انگلی کاٹ شہیدوں میں داخل ہو جاؤ، بلکہ
انگلی کاٹ کے بغیر ہی تم غازی ہو جاؤ گے۔ کچھ دیر
کے لیے چلے جاؤ۔ پھر تم کو تین تین دن کی چھٹی مل سکتی
ہے۔ بھائی جان نتیجہ کے اعتبار سے تو دونوں کا ہونا ایک
رہا۔ جو جنگ میں نہیں گئے اور جو جاکر نہ ٹھہرے، بات
تو ایک ہی ہوئی بلکہ ایک بھی کہاں، جس نے روزہ رکھا
ہی نہیں۔ گنہگار تو وہ بھی ہے لیکن جو رکھ کر لذاتِ دنیا
کے لیے توڑ دے وہ اس سے بھی زیادہ گنہگار ہے جو نماز
نہ پڑھے وہ بھی گنہگار ہے لیکن جو شروع کرکے بیچ میں

بار بار وہ نیت توڑ دے وہ کہیں زیادہ گنہگار ہے۔ جو
مستطیع ہونے پر حج نہ کرے گنہگار ہے لیکن جو احرام باندھ
کر بعض ارکان ادا کر کے بعض ارکان بلا عذرِ شرعی چھوڑ بھاگے
وہ اس سے زیادہ گنہگار ہے۔ رہا درگزر کرنے کا مسئلہ
تو نبی کریم ؐ نے نہ ان کو سزا دی جو جنگ میں جاکر نہ ٹھہرے
نہ ان کو سزا دی جو شریکِ جنگ ہی نہ ہوئے جن کو مخلفین کہا
جاتا ہے ان کے بارے میں بھی فاعرضوا عنہم قرآنِ کریم
نے کہا ہے کہ ان لوگوں سے درگزر کرو۔ سیحلفون باللہ
لکم اذا انقلبتم الیھم لتعرضوا عنھم فاعرضوا
عنھم الخ۔ "وہ لوگ جب تمھاری واپسی پر تم سے ملیں
گے تو قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے کوئی تعرض نہ کرو
پس تم ان سے تعرض نہ کرو" سورۂ توبہ ۔ چنانچہ فرمایا
تھا "جن ہستیوں نے اللہ کی رضا کے لیے گھر بار، مال و دولت
سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہجرت فرمائی اور جو خود خلفے رہ کر
بھی دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینے والے تھے کیا ان

کے متعلق باور کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے حصولِ اقتدار
کے لیے جنگِ جمل و صفین کا میدانِ کارزار گرم کیا ہو؟"

مخاطب محترم نے بلاغ القرآن اگست ۶۷ء میں فتح مکہ کے بعد مکہ سے مدینہ آنے والوں کو مہاجرین ثابت کرنیکی ناکام کوشش کی تھی

ہم نے یہ دیکھ کر کہ موصوف فتح مکہ کے بعد مدینہ میں
آجانے والے اہلِ مکہ کو بھی مہاجر قرار دے رہے ہیں
ان کی گرفت کی اور جواباً عرض کیا کہ مہاجرین کا لفظ
ان اہلِ مکہ کے لیے جو بعدِ فتح مدینہ میں آکر بس گئے
معیارِ قرآنی کے خلاف ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ انھوں
نے گھر کے ساتھ بار، مال، دولت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر
ہجرت فرمائی تھی۔ کیونکہ ان کو یہ ان کا سب کچھ چھوڑنے
پر کون مجبور کرنے والا تھا۔ ان کا مال، ان کی دولت کس

نے ان سے چھین لی۔ اب تک یہی لوگ تھے جنھوں نے نبیؐ
اور مسلمانوں کو مکہ سے خالی ہاتھ نکلنے پر مجبور کیا تھا۔ یہی لوگ
نبیؐ اور مسلمانوں پر ظلم کر رہے تھے جس کی وجہ سے مصیبت
کے مارے مسلمان اپنا گھر در سب کچھ چھوڑ کر اپنے وطن
آبائی سے ہجرت کر رہے تھے۔ اب ان کو کون مکہ سے نکال
رہا تھا۔ ان کو کون مصیبت اور دکھ دے رہا تھا۔ قرآنِ
کریم نے تو مہاجرین ان کو کہا ہے جن کو زبردستی ان کے گھروں
سے نکالا گیا۔ اخرجوا من دیارھم۔ جن کو مکہ میں ہر طرح
کی مصیبت دی گئی۔ من بعد ما فتنوا۔ ہمارے اس
احتساب کے بعد موصوف کو یہ تسلیم کرنا چاہیے تھا کہ
لفظ ہجرت اور مال و دولت کے چھوڑنے کے الفاظ
محض جوشِ محبت میں سہواً بلا ارادہ لکھے گئے تھے۔ کیونکہ
صحیح بات کا تسلیم کرنا عیب نہیں بلکہ نہ تسلیم کرنا عیب
ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ موصوف نے ہماری اس تحریر کے
بعد بھی اپنی وہ سابقہ عبارت تحفظ ناموس صحابہ نمبر میں لفظ

کی اور اس کا غلط ہونا نہ مانا۔ اتنا کیا کہ تحفظ نمبر میں اب
صرف گھر بار کا چھوڑنا بیان فرمایا۔ مال، دولت سب کچھ
چھوڑ کر ہجرت کرنا نہ فرما سکے۔ چنانچہ اب ان کی تازہ تحریر
یہ ہے :-

"خصوصاً جب کہ ایک گروہ (اہل مکہ بعد فتح مکہ)
اللہ کے دین کے لیے گھر بار چھوڑ کر مکہ سے مدینہ کی طرف
ہجرت کر آیا تھا۔"

موصوف کا لفظ ہجرت جو سراسر غیر قرآنی ہے
اب بھی چل رہا ہے۔ مشغل ہے ان کا بلاغ القرآن اور عمل
ہے ان کا مخالفت قرآن۔ جب قرآن کریم ان کو قرآنی
مہاجر نہیں قرار دیتا تو آپ یہ کیوں قسم کھائے بیٹھے ہیں کہ
جس ڈھب سے ہوگا قرآن کریم کی مخالفت کریں گے۔ ان
لوگوں کا فتح مکہ کے بعد مکہ سے مدینہ آجانا اللہ کے دین اور
اللہ کی رضا کے لیے تھا۔ یہ آپ کو کس نے بتایا۔ اللہ کہاں سے
معلوم ہوا تھا۔ کیا یہ خبر آپ کو قرآن کریم نے دی ہے؟ یا خود

آپ پر وحی آئی ہے یا آپ دلوں کی بات کے جاننے
والے عالم الغیب ہیں۔ کیا جو مسلمان اب بھی مکہ میں رہ
گئے تھے وہ کیا اللہ کی رضا کے طالب اور دیندار نہ تھے؟
مکہ ویران تو نہ ہوا تھا۔ کیا دینداری مکہ چھوڑ کر مدینہ میں آ
بسنے ہی میں منحصر تھی؟ کیا مسلمان ہو کر بیت اللہ اور حرم
خدا کی پاسبانی، دینداری اور موجب رضائے خدا نہ تھی۔
کیا واقعات اظہر من الشمس ہو کر یہ نہیں بتا رہے ہیں کہ
مکہ سے ان کے مدینہ میں آنے کی صرف یہ وجہ تھی کہ
جو اسلام دشمنی ہم دور بیٹھے کر رہے تھے۔ اب اسلام
کا لبادہ اوڑھ کر قریب سے کریں۔ موصوف تحفظ نمبر کے
صفحہ پر لکھتے ہیں۔

کیا خلافت ثلاثہ پچانوے فیصدی مسلمانوں
کا تواتر نہیں؟ ہے، اور ہمارے آپ کے
مشاہدہ میں ہے پھر آپ اس تواتر کی مخالفت
کیوں کر رہے ہیں۔"

ہے۔ یہ سراسر غلط ہے کہ ہم تواتر کی مخالفت کر رہے ہیں۔ تواتر کے ہوتے ہوئے مخالفت کرنا محض بے عقل کا کام ہے نہ ہم کو ثلاثہ کی خلافت کے تواتر سے اختلاف ہے۔ نہ کسی اور خلیفہ کی خلافت سے۔ شیعہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ ثلاثہ یا ان کے بعد اور لوگ خلیفہ نہیں ہوئے۔ جنگِ جمل و صفین کے تواتر سے انکار کر کے آپ کیوں ہم کو تواتر کا خواہ مخواہ منکر کہہ کر ہم پر بہتان باندھتے ہیں۔ خلافتِ ثلاثہ پچانوے فیصد مسلمانوں کا تواتر آپ کیسے کہہ رہے ہیں۔ خلافتِ ثلاثہ تو سو فیصد مسلمانوں کا تواتر ہے۔

مخاطب محترم اسی صفحہ ۴۴ پر رقم طراز ہیں:۔

"کیا آپ قرآن کے الفاظ محمد رسول اللہ کی شہادت پر رسالتِ محمدی کے قائل ہونا نہیں چاہتے۔"

مخاطب عزیز جو کچھ کہیے سوچ کر کہیے۔ آپ نے رسالت کو قرآن کی شہادت سے مانا تو قرآن کو قرآن

کس کی شہادت سے مانا آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ دور محال ہے اور سراسر باطل ہے یعنی یہ کہنا کہ ہم نے رسالت کو مانا قرآن سے اور قرآن کو مانا رسالت سے۔ یہ ہوا دور۔ یہ بات ایسی ہوئی کہ زید نے پیدا کیا بکر کو اور بکر نے پیدا کیا زید کو۔ نبی کو کتاب سے نہیں مانا جاتا۔ بلکہ کتاب کو نبی سے مانا جاتا ہے۔ پہلے مانی جاتی ہے نبوت پھر نبوت منواتی ہے کتاب کو۔ آیہ محمد رسول اللہ تو آیا ہے صلح حدیبیہ کے بعد یعنی ہجرتِ نبوی کے برسوں بعد ہزاروں لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ اس آیت سے پہلے ہی وہ کس شہادت پر ایمان لائے تھے۔ ان کو تو ایمان اس شہادت والی آیت پر لانا چاہیے تھا تو کیے کہ یہ لوگ قرآن میں نامِ محمد آنے تک نبوت پر ایمان ہی نہ رکھتے تھے؟ معاذ اللہ

مخاطب محترم صفحہ ۵۵ تحفظ نمبر پہ لکھتے ہیں:۔

"زندہ قومیں چاند اور مشتری کی سیر کے لیے منصوبوں پر کمندیں پھینک رہی ہیں اور یہ

چودہ سو سال کی سابقہ خلافتوں کے جھگڑے

لیے بیٹھے ہیں۔"

آپ کے نزدیک ستاروں پر کمندیں پھینکنے والے
چاند اور مشتری کے سیر کرنے والے یہ ہیں زندہ قومیں باقی
ہوئیں مردہ قومیں۔ تبھی کے لیے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں
کہ انھوں نے کمند پھینکے بغیر چاند اور مشتری ہی نہیں بلکہ
سیر سماوات فرمائی اور مقام قاب قوسین تک پہنچے
مگر صحابۂ کرام جن کی ناموس کا آپ تحفظ کر رہے ہیں وہ
آپ کے نزدیک زندہ قوم نہ ہوتے بلکہ مردہ ہوتے
کیا انھوں نے بھی ستاروں پر کوئی کمند پھینکی تھی؟ ائمہ اہلبیت
کے متعلق تو یہ ملتا بھی ہے کہ کبھی انھوں نے یہ فرمایا کہ عرش
خدا سے جو کچھ ادھر ہے وہ مجھ سے پوچھ لو کبھی یہ فرمایا کہ میں
آسمانی راستوں کو زیادہ سے زیادہ جانتا ہوں۔ کبھی یہ فرمایا
کہ کائنات کے پردے بھی اٹھا دیے جائیں تو میرے یقین
میں اب کوئی زیادتی نہیں ہو سکتی۔ وہ حضرات لوح محفوظ

کا بچپن ہی میں مطالعہ فرماتے تھے ان کے لیے ڈوبا ہوا
آفتاب پلٹا۔ مگر صحابۂ کرام کو تو آپ بالکل مردہ قوم قرار
دے رہے ہیں۔ آپ کا تمام تر نظریہ آپ کے اس
ایک جملے سے عیاں ہو رہا ہے۔ آپ کے نزدیک صرف
وہ قومیں زندہ ہیں جو اپنی آخرت اور عاقبت سے بے نیاز
ہو کر ہمہ تن دنیا طلبی میں مصروف ہیں۔ آخرت کے طلبگار محض
مردہ ہیں آپ کا بلاغ القرآن بھی آپ کے اسی مقصد کے لیے
ہوگا۔ شہداء، انبیاء، سب انبیاء کو بھی آپ مردہ اس
ہی لیے فرما رہے ہیں کہ انھوں نے اپنی دنیا نہ بنائی آخرت
بنائی۔ جہاد سے بھاگ جانے والوں کی حمایت بھی آپ اس
ہی لیے کر رہے ہیں کہ وہ طالب دنیا تھے غرض کہ جو دل دنیا
کے لیے جو لوگ سب کچھ کر رہے ہیں اور کر چکے ہیں۔ آپ ان دل
دل سے ان کے ساتھ ہیں اور ایسے لوگوں کی کمند میں آپ
خود پھنس چکے ہیں لیکن اس طرح میرے مہربان نہ دنیا
بنتی ہے نہ آخرت۔ کس طرح؟ کہ [illegible]

بجائے آپ کمندیں پھینک رہے ہیں قرآن کریم پر اس سے
نہ نفع دنیا نہ نفع آخرت۔

آپ جمل اور صفین کے اس غازی کی کیوں حمایت
کریں جس نے حب دنیا کو تین طلاق دے دی تھیں۔ آپ
تو حمایت ان کی ہی کریں گے جنہوں نے اپنی کمندیں قرآن کو
لے کر قرآن کے نام سے مسلمانوں پر کمند پھینکی۔ خلافت کے
چودہ سو سال پہلے کے جھگڑے کو لے بیٹھے ہیں۔ ہم نے
جھگڑا کب کیا اور جھگڑا کب سمجھا ہم تو عہد نبوی ہی سے اس مسئلہ
کو طے شدہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے سامنے نہ کوئی فیصلہ طلب
قضیہ تھا اور نہ ہے۔ البتہ یہ خطاب قرآن کریم سے کیجیے
کہ زندہ قومیں تو چاند اور مشتری کی سیر کرنے کے لیے ستاروں
پر کمندیں پھینک رہی ہیں اور تو ہے کہ اسی جھگڑے کو لیے
بیٹھا ہے کہ آدم کو سجدہ کس نے کیا تھا کس نے نہیں خلافت
الٰہیہ کو کس کس نے مانا، کس کس نے نہیں۔ میدان احد سے
کون بھاگا کون نہیں۔ دعویٰ خلافت کس سے ہوا کس سے

نہیں۔ حنین میں کون ثابت قدم رہا کون نہیں؟ اب ان
قصوں سے فائدہ؟ روزمرہ بچا پڑھوانے رہنے کا نتیجہ؟
تحفظ نمبر کے صفحہ ۲۶ کو بھی دیکھیے۔ فرماتے ہیں:۔
"جنگ جمل کی واقعیت اتنی ہے سیدھی دلیل
لائی گئی ہے کہ اس لڑائی میں ام المومنین اپنی مرضی
سے نہیں گئی تھیں بلکہ لانے والے ان کو خوف زدہ
کر کے لائے تھے، وغیرہ"

موصوف نے فرض امانت کو بالکل بھلا دیا۔ میرے
الفاظ تو صرف یہ ہیں: "آپ چاہتے تو کہہ سکتے تھے کہ
آیت اشداء علی الکفار مردوں کے لیے ہے مستورات کے
لیے نہیں ہے۔ اسی طرح آپ چاہتے تو ام المومنین کے
لیے علماء اہلسنت سے متفق ہو کر کہہ سکتے تھے کہ وہ جنگ
جمل میں خود اپنی مرضی سے نہیں گئی تھیں بلکہ لانے والے اپنی
غرض سے ان کو خوف زدہ کر کے لائے تھے۔ صفحہ ۲۹
صحابیت کا قرآنی تصور"

کیا کوئی صاحبِ عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ عبارت خود میری کوئی دلیل ہے یا خود میرا کوئی دعویٰ ہے۔ میں نے تو ام المومنین کی حمایت کا آپ کو موقع دیا تھا جو عام علماءؒ نے اختیار کیا ہے۔ آپ کو یہ طرزِ حمایت پسند نہیں ہے تو نہ کیجیے اور کہہ دیجیے کہ نہیں وہ اپنی مرضی سے گئی تھیں لیکن آپ کی یہ حمایت تو کوئی بھی چیز نہیں کہ جنگِ جمل ہوئی ہی نہیں۔

اہلبیتِ رسولؐ سے ہمارے مخاطب محترم کا برتاؤ

فرماتے ہیں:-

"حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق تاریخ کہتی ہے کہ آپ نے سو، ساٹھ یا پچاس بے گناہ عورتوں کو طلاق دیا تھا۔ اب جبکہ ہم نے "تاریخ" کی یہ بات مان لی کہ حضرت حسنؓ نبی اکرمؐ کے نیک نواسے تھے اور پروردۂ آغوشِ نبوت تھے تو پھر تاریخ کی مذکورہ خبر کو ماننا ہمارے بس کا روگ نہیں"

ناظرین غور فرمائیں ہمارے مخاطب کو حضرت حسنؑ کا نیک نواسۂ رسولؐ اور پروردۂ آغوشِ نبوت ہونا صرف تاریخ نے بتایا ہے قرآن نے نہیں بتایا۔ ہر خبر تو ان کو ملتی ہے قرآن سے یہاں تک کہ انھوں نے رسالت کو بھی قرآن ہی سے مانا ہے۔ قرآن کو رسالت سے نہیں مانا۔ لیکن حضرت حسنؑ کا نیک نواسہ ہونا نہ ان کو قرآن نے بتایا نہ تفسیر القرآن بالقرآن نے۔ حضرت حسنؑ کا ذکر ہی ان کو قرآن میں نہ ملا۔ حضرت حسنؑ کا نیک نواسۂ رسولؐ ہونا صرف اسی تاریخ میں ہے جو نہایت کمزور ہے۔ قرآن میں نہیں ہے ورنہ وہ بجائے اس کے کہ جب کہ ہم نے تاریخ کی یہ بات مان لی کہ حضرت حسنؑ نبی اکرمؐ کے نیک نواسے تھے یہ لکھتے کہ جب کہ ہم نے قرآن کی رو سے یہ مان لیا کہ حضرت حسنؑ نبی اکرمؐ کے صادق و طاہر فرزند تھے۔

یہ ہے قرآن اور اہلبیتؑ سے انتہائی ضد اور اہلبیت طاہرینؑ سے انتہائی عداوت۔ ہمارے مخاطب نے نہ تو

اس قرآن میں آیۂ مباہلہ فقل تعالوا ندع ابناءنا و
ابناءکم پڑھا ہے جس میں ان کو سب سے پہلے حضرت حسنؑ
کا ذکر اور ان کا فرزند رسولؐ ہونا ان کا صغر سنی میں شریک کار
نبوت ہونا ان کا خدا کے نزدیک صادق ہونا اور کاذبین
کے مقابلہ کے لیے بھیجا جانا نظر آیا نہ ان کو اس قرآن میں
آیۂ تطہیر انما یرید اللہ لیذہب عنکم الرجس
اہل البیت ویطہرکم تطہیرا نظر آیا جس سے
ان کو رداء نبیؐ میں حضرت حسنؑ کا ہونا اور نبیؐ کے ساتھ
ساتھ ان کا انتہائی طاہر و مطہر اور بے رجس ہونا نظر آتا۔
ہمارے مخاطب کو وعدۂ خلافت والی آیتِ قرآنی میں نبیؐ کے
غیر اور بیگانے تو سب نظر آگئے لیکن حضرت حسنؑ ان کو اس آیت
میں بھی نظر نہ آئے۔ نہ ہمارے موصوف کو قرآنِ کریم میں
قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربی
نظر آیا جو موصوف کو نظر آتا کہ حضرت حسنؑ کی محبت اجرِ رسالت
ہے۔ ہم موصوف کی اس صریح گستاخی پر کہ نہ تو امام عالی

کے ساتھ لفظ امام ہے نہ ان کی نیکی اور نبیؐ کا نواسہ ہونے
کی خبر قرآنی ہے یہ شعر پڑھ دینے پر مجبور ہیں۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

میرے مخاطب کو فتح مکہ کے بعد کے مسلمانوں
کے لیے تو آیۂ قرآنی اشداء علی الکفار نظر آگیا لیکن
امام ہمام عالی مقام فرزند رسولِ انامؐ سید جوانانِ اہلِ
جنت وسیلۂ حصولِ نجات و مغفرت صاحبِ عصمت و
طہارت، تفسیرِ کوثر، جگر گوشۂ زہراؑ و حیدرؑ کے لیے قرآن
بھر میں کوئی آیت نہ ملی۔ کس کا منہ ہے جو اس قمر کے سامنے
آئے۔ کس کا بھائی ہے جو اس کے بھائی کا جواب ہو۔ کس کا
باپ ہے جو اس کے باپ کا جواب ہو۔ کس کی ماں ہے
جو اسکی ماں کا جواب ہو۔ کس کا نانا ہے جو اس کے نانا کا
جواب ہو۔ کس کی نانی ہے جو اسکی نانی کا جواب ہو۔ کس کا
دادا ہے جو اس کے دادا کا جواب ہو۔ کس کی دادی ہے

بجز اسکی دادی کا جواب ہو۔ زمین کے ذرّے عرش کے ستاروں کی ہمسری نہیں کر سکتے۔ بھلا جو شخص شجرۂ رسالت کی شاخوں ہی کو قلم کر رہا ہو اس سے یہ امید کہ وہ اس شجر کے سایہ میں آکر ... ان کی یعنی اصحاب رسولؐ کی ناموس کا تحفظ کرے گا کس قدر غلط ہے۔ میرے مخاطب محترم کے قلم سے قدرت نے یہ جملہ لکھوا کر کہ "تاریخ کہتی ہے کہ آپ (حسنؑ) نے سو، ساٹھ یا پچاس بے گناہ عورتوں کو طلاق دیا تھا" حقیقت کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا کیونکہ وہ تاریخ کے ہر مسلمہ کو فرماتے تھے کہ یہ عجمی سازش ہے جس نے صحابہ کی "تاریخ کو داغدار کیا ہے حالانکہ غلطی یہ ہے کہ داغداروں کو صحابہ مانا جا رہا ہے۔ اب موصوف بتائیں کہ "تاریخ اہلبیت اور تاریخ امام علیہ السلام کو کس نے داغدار کیا؟ یہ تو عجمی سازش نہیں ہو سکتی۔ یہ سازش تو عربی اور اموی ہی ہو سکتی ہے جن کو اہل بیتؑ اور امام علیہم السلام سے دشمنی تھی۔ اب ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں۔ تحریر موصوف کی بے جا

طوالت نے ہم کو مقصد کی طرف آنے میں بہت دیر لگا دی

صحابیت کا قرآنی تصور:

ہم نے اپنے کتابچہ میں لکھا تھا کہ لفظ صحابہ، اصحاب آج ایک مستقل لقب، اعزاز، شرف کی حیثیت سے استعمال ہو رہا ہے اور اس پردہ میں ان نام نہاد مسلمانوں تک کی حمایت ہو رہی ہے جنکی قرآن کریم نے جا بجا مذمت، شکایت اور منقصت کی ہے۔ جن کے بارہ میں اللہ نے مومنین کو حکم دیا ہے کہ سب ان سے قتال کریں۔ فقاتلوا التی تبغی "مومنو! تم سب قتال کرو اس کے جلنے والے مومنوں کے گروہ سے جو بغاوت کرے"۔ اس بنا پر ہم نے لفظ صحابہ، اصحاب کا مکمل حدود اربعہ اور اسکی وجہ تسمیہ کو ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ قرآن کریم نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام میں سے کسی بھی نبیؑ کے ماننے والوں اور فرماں برداروں اور ساتھ دینے والوں کو صحابہ یا اصحاب لقب نہیں دیا

لہٰذا جس تصور میں یہ لفظ آج استعمال ہو رہا ہے یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ لفظ مضاف اور نبیؐ کو مضاف الیہ قرار دے کر صرف دو جگہ استعمال کیا ہے۔

۱۔ اذ یقول لصاحبہٖ۔ جب کہ نبیؐ اپنے ساتھ والے سے کہہ رہے تھے۔

۲۔ قال اصحٰب موسیٰ انا لمدرکون۔ موسیٰ کے ساتھ والے بولے، تو ہم پکڑے گئے۔

دونوں جگہ قرآنِ کریم نے کسی کو صاحب اور کچھ لوگوں کو اصحاب اس حالت میں کہا ہے جبکہ وہ موقع پر نبی کے ساتھ تھے۔ ساتھ کہا جب وہ ساتھ تھے ساتھ کہا اس لیے کہ وہ ساتھ تھے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کسی کو ساتھ صرف اس وقت کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ وہ ساتھ ہو لیکن اس وقت ساتھ کہنا غلط ہے جب کہ وہ ساتھ نہ ہو ساتھ والے کے لیے عربی ہے صاحب۔ ساتھ والوں کی عربی ہے اصحاب، صحابہ۔ جب ساتھ ہے تو ساتھ ظاہر کرنے کے

لیے آئے گا صاحب۔ جب ساتھ ہیں تو ساتھ ظاہر کرنے کے لیے آئے گا اصحاب۔ لیکن جب وہ نبیؐ کے ساتھ نہ ہوں کسی اور کے ساتھ ہوں، اپنے ماں باپ کے ساتھ ہوں بہن بھائی کے ساتھ ہوں، بیوی بچوں کے ساتھ ہوں دوست، احباب کے ساتھ ہوں تو اس وقت اگر ساتھ کہنا ہی ہے تو اس کے ساتھ کہو جس کے ساتھ ہیں۔ اس حالت میں یہ کہنا کہ نبی کے ساتھ ہیں' غلط ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ لفظ قرآن نے کوئی لقب نہیں بنایا صرف حالت کے ظاہر کرنے کے لیے کہا ہے۔ اس لفظ کا لقب ہونا اس وقت ظاہر ہوتا جب کوئی نبیؐ کے ساتھ نہ ہونے پر بھی صاحبِ نبی کہا گیا ہو یا کسی جماعت کو نبیؐ سے الگ کسی اور جگہ ہونے پر بھی اصحابِ نبیؐ کہا گیا ہو لیکن اس کی کوئی مثال قرآنِ مجید میں نہیں ہے۔ لفظ کے استعمال کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کسی مستقل صفت کو ظاہر کرنے کے لیے ہو۔ یہ ہوتا اس کا لقب جیسے عالم، جاہل

مومن، کافر، مہاجر، انصار، اہل البیت، ام المومنین، نبی،
امام، ائمت، زوجہ، شوہر، ماں، باپ، بھائی، بہن،
وغیرہ۔ یہ لفظ کسی خاص وقت کے لیے نہیں ہیں بلکہ ایک
مستقل صفت ہے۔ سوتے ہوں یا جاگتے ہوں بیٹھے ہوں
لیٹے ہوں چل رہے ہوں، کھا رہے ہوں، نہا رہے ہوں،
خاموش ہوں، بول رہے ہوں۔ آج ہوں، کل ہوں، صبح
کو ہوں شام کو ہوں، دن میں ہوں، رات میں ہوں، ہر
صورت میں یہ ان کی صفت ہے اور ان الفاظ کے وہ مستحق
ہیں۔ دوسری حیثیت یہ ہے کہ لفظ کسی وقتی حالت کو
ظاہر کرنے کے لیے ہو جیسے نائم سوتا ہوا، قائم کھڑا ہوا،
قاعد بیٹھا ہوا، غضبان غصہ میں بھرا ہوا، خائف ڈرا ہوا،
صاحب ساتھ والا۔ یہ لفظ چونکہ صرف وقتی حالت کو
ظاہر کرتے کے لیے ہیں لہذا صرف اس ہی حالت میں بولے
جائیں گے جبکہ وہ حالت موجود ہو ورنہ نہیں۔ سو رہا ہو تو نائم
کہا جائے گا۔ یہ نہیں کہ جاگنے پر بھی نائم کہا جا سکے۔ کھڑا

ہو تو قائم کہا جائے گا مگر بیٹھ جانے اور لیٹ جانے پر قائم
کہنا غلط ہوگا۔ بیٹھے ہوئے کو قاعد کہا جائے گا مگر کھڑے
ہو جانے پر قاعد کہنا غلط ہے۔ غصہ میں بھرا ہو تو غضبان
ہے لیکن ہر حالت میں نہیں۔ خوف کے وقت وہ خائف
ہے سبب خوف ہو جانے کے بعد نہیں۔ کسی کے ساتھ
ہے تو اس کا صاحب ہے۔ جب ساتھ نہ رہا تو اب اس
کا صاحب نہیں کیونکہ یہ الفاظ لقب نہیں ہیں ایک حالت
کو ظاہر کرنے کے لیے ہیں۔ اور اگر لفظ صاحب کسی کا لقب
ہوگا تو پھر اس کے معنیٰ ساتھ والے کے نہ ہوں گے کچھ اور
ہوں گے۔ جیسے صاحبِ مال، صاحبِ خانہ، صاحبِ
قوم۔ یہاں صاحب کے معنیٰ ساتھ والے کے نہیں بلکہ مالک
اور سردار کے ہیں۔ اسی معنیٰ سے نبیؐ کو صاحبکم فرمایا
گیا ہے۔ صاحبِ مال اپنے مال سے قریب ہو یا دور، ہر
حالت میں صاحبِ مال ہے۔ صاحبِ خانہ گھر میں ہو
یا ہزار کوس دور ہر حالت میں صاحبِ خانہ ہے کیونکہ اس

کی مستقل صفت اور لقب ہے۔ قرآن مجید نے کسی نبی
کی امت حاضرہ کو یا امت حاضرہ کے کسی فرد کو صاحب
نبیؐ یا اصحاب نبیؐ کا لقب نہیں دیا۔ اگر یہ لقب ہوتا تو
کہیں نہ کہیں ایسی حالت میں بھی کسی فرد یا کسی جماعت کے
لیے کہا گیا ہوتا جبکہ وہ نبیؐ کے ساتھ نہ ہوں۔ اس کی کوئی
مثال قرآن میں نہیں ہے۔ کسی کو صاحب نبیؐ صرف اس
وقت کہا گیا جبکہ وہ حقیقتاً ساتھ ہی تھے۔ جماعت کو
اصحاب موسیٰؑ صرف اس وقت کہا گیا جبکہ وہ موسیٰ کے
حقیقتاً ساتھ اور ہم سفر تھے۔ تیسری کوئی مثال نہیں۔ تو
جو لفظ قرآن کریم نے ایک وقتی حالت کو ظاہر کرنے کے
لیے کہا۔ اگر اسکو بغیر اس حالت کے بھی استعمال کیا جائے
تو یہ بالکل ایسا ہو گا کہ جیسے کوئی شخص حضرت زکریاؑ کو
ہر حالت میں قائم کھڑا ہوا مان لے۔ اس لیے کہ قرآن
نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ وہ کھڑے ہوئے نماز پڑھ
رہے تھے۔ قائم یصلی فی المحراب۔ تو اب

ان کا لقب ہی قائم ہو گیا۔ یا کوئی شخص جناب سارہ زوجہ خلیلؑ
کا لقب قرار دے دے قائمہ۔ کیونکہ قرآن نے کہا ہے کہ
جب ہمارے فرشتے بشارت لے کر ابراہیمؑ کے پاس گئے
تو اس وقت ان کی زوجہ کھڑی تھیں وامرأته قائمة
لیکن نہیں، نہ قرآن میں اس لفظ کے آجانے سے زکریاؑ
کا لقب قائم ہوا نہ سارہؑ کا لقب قائمہ ہوا نہ موسیٰؑ کا
لقب غضبان ہوا نہ یونسؑ کا لقب مغاضب ہوا۔ کیونکہ
قرآن نے یہ سب لفظ محض وقتی حالت کے لیے استعمال کیے
تھے۔ تو پھر صاحب اور اصحاب بھی لقب نہیں۔ ان لفظوں
کا اب جو مستقل طور پر استعمال ہو رہا ہے یہ لفظ اور اس لفظ
کا استعمال خالص غیر قرآنی ہے۔ ہمارے مخاطب محترم اس
کا کوئی جواب نہ دے سکے تھے نہ دے سکے۔ سخن پروری
سے کام چلاتے ہیں مگر اس طرح کام نہیں چلتا۔ وہ دس
بیس نہیں دو چار نہیں صرف ایک آیت ایسی دکھا دیں
جس میں کسی کو لفظ صاحب نبیؐ یا اصحاب نبیؐ اس وقت

کہا ہو جب کہ وہ نبیؐ کے ساتھ ایک جگہ موجود نہ ہو۔
اس بحث کو ہمارے کتابچہ صحابیت کا قرآنی تصور
میں ملاحظہ فرمائیں۔ اب جب کہ قرآن نے کبھی کسی کو
یہ لقب دیا ہی نہیں تو فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر
یہ لفظ آیا کہاں سے اور آیا کب اور آیا کیوں اور آیا تو
ایسا آیا کہ جو پاکیزہ گرانقدر اور بیش بہا الفاظ اس
مقدس جماعت کے لیے قرآنِ کریم نے کہے تھے وہ سب
کالعدم ہو گئے اور قرآنی الفاظ کی جگہ اس غیر قرآنی لفظ
صحابہ نے لے لی۔ قرآنی لفظ سب پیچھے جا پڑے اور یہ
غیر قرآنی لفظ الفاظِ قرآنی کا امام بن گیا۔ قرآنِ کریم نے
اس مقدس جماعت کو مومنین و مسلمین کہا تھا۔ یہ لفظ عام تھا
پھر باہمی امتیاز کے لیے قرآن نے السابقون الاولون
کہا تھا سابقین کے لیے۔ مہاجرین کہا تھا ہجرت کرنے والوں
کے لیے۔ انصار کہا تھا اہلِ مدینہ کے لیے۔ اہل البیت کہا
تھا خاندانِ نبوی کے لیے۔ امہات المومنین کہا تھا ازواج

نبیؐ کے لیے۔ غرضکہ کوئی نمایاں طبقہ ایسا نہ تھا کہ جس کے
لیے قرآن نے نمایاں لفظ نہ کہا ہو اب ان میں سے کسی طبقہ
کو کسی اور لقب کی ضرورت باقی نہ رہی۔ یہ کیوں۔ اپنے لیے
کوئی نیا اور غیر قرآنی لفظ تلاش کریں جبکہ ان کے لیے قرآنی
لفظ خود موجود ہیں۔ آخر میں ایک اور طبقہ زمرۂ اسلام میں
داخل ہوا جس کے لیے موجودہ الفاظ میں کوئی گنجائش نہ تھی۔
پہلے تو اس طبقہ نے یہ کوشش کی کہ ہم بھی مکہ چھوڑ کر مدینہ میں
آ بسے ہیں لہٰذا ہم بھی مہاجرین میں ہیں لیکن ان کو بروقت
ٹوک دیا گیا کہ قرآنی مہاجرین صرف وہ ہیں کہ جن کو زبردستی
نکالا گیا ہے۔ جو آیت کی رو سے بظلم و ستم اور مصیبت زدگی
میں اپنے گھروں سے نکلے ہیں لیکن فتح مکہ کے بعد ہجرت
کیسی؟ یہاں سے شکست ہوئی تو نیا راستہ نکالا کیونکہ ان کو
مؤلفۃ القلوب اور طلقاء، یہ گھٹیا لفظ از روئے قرآن و حدیث
کہے جاتے تھے۔ مقابلہ کرنا تھا ان کو اس ذات کا جو اہل البیتؑ
بھی ہیں۔ آلِ محمدؐ بھی ہیں۔ سابق اور اول بھی ہیں۔ مہاجر بھی

ہیں اور کون جان سکتا ہے کہ عند اللہ کیا کیا ہیں۔ بڑی
شدید ضرورت تھی کہ کوئی ایسا لفظ ہو جس سے پست بلند
گھٹیا، بڑھیا سب برابر ہو جائیں اور امتیازات سب ختم
ہو جائیں۔ چنانچہ وہ لفظ قرار پایا صحابہ، جس نے سابق
لاحق مہاجر، طلیق صریح، لصیق مومن مدغل محق مبطل
سب کو برابر کر دیا اور اپنے عوام سے اس لفظ کی بزورِ حکومت
ایسی اشاعت کی کہ اب ہر جگہ یہی لفظ ہے چنانچہ تحفظ ناموس
مہاجرین میں کہاں ان کو گنجائش ملتی تحفظ ناموسِ انصار میں
تحفظ ناموسِ سابقین میں، تحفظ ناموسِ اہل البیت میں کسی
لفظ میں بھی ان کو گنجائش کہاں ملتی۔ ان کو تو گنجائش تحفظ ناموسِ
صحابہ ہی میں مل سکتی ہے۔ یہ ہیں اس لفظ کے حدود یہ ہے
اس لفظ کی وجہ تسمیہ۔ چنانچہ آج بھی ان ہی طلقاء اور مولفۃ
القلوب طبقہ کی حمایت میں تحفظ ناموسِ صحابہ کا علم اٹھایا جاتا
ہے۔ تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر لکھا جاتا ہے ایسے ہی لوگوں کی حمایت
میں جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے وقوع سے انکار کیا جاتا ہے

اگر حضرت ام المومنین کی حمایت کا راستہ دکھایا جاتا ہے تو
وہ بھی گوارا نہیں کیونکہ اس صورت میں تو صرف ام المومنین کی
حمایت کا پہلو نکلتا ہے جن کی حمایت مقصود ہے۔ ان کی
حیثیت تو صاف نہ ہوئی لہٰذا صحابہ کہہ کر ہر کس و ناکس کو اس
لفظ میں شامل کیا گیا تاکہ مسلمان اس لفظ کی موجودگی میں کچھ
بول ہی نہ سکیں۔ اس لیے ہم نے وضاحت کر دی کہ قرآن
نے کسی امت کو یا کسی فردِ امت کو یہ لقب دیا ہی نہیں خود
کوئی شخص اپنی جگہ صاحبِ شرف ہو تو ہو لیکن قرآنِ کریم نے
کسی کو صاحبِ نبی یا اصحابِ موسیٰ کسی شرف کی بنا پر نہیں
کیا بلکہ لغوی معنی میں صرف ساتھ ہونے کی بنا پر کہا، یہاں
اس سے بحث ہی نہیں کہ وہ ایمان و عمل اور دین اور دنیا کے
اعتبار سے کیسے تھے کیا تھے کس درجہ پر تھے، اچھے تھے
یا برے تھے۔ اس بحث سے یہاں بالکل قطع نظر ہے
یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ دونوں آیات میں لفظ صاحب
یا لفظ اصحاب یہ وہ لفظ نہیں ہیں جو موقع پر کہے گئے ہوں

ہمارے نبیؐ نے یا حضرت موسیٰؑ نے صاحب یا اصحاب کہہ کر
کسی سے خطاب نہیں کیا۔ آیت نے یہ لفظ صرف یہ حوالہ دینے
کے لیے استعمال کیا ہے کہ ہمارے نبیؐ نے جو لاتحزن ان اللّٰہ
معنا کہا تھا یہ کس سے کہا تھا۔ اس سے، جو ان کے ساتھ تھا
اور موسیٰ سے جو یہ کہا تھا کہ ہم پکڑے گئے، یہ کس نے کہا تھا؟
انھوں نے جو موسیٰ کے ساتھ تھے۔ خود نبیؐ نے لاتحزن
والا جملہ صاحب کہہ کر نہیں کہا۔ خود حضرت موسیٰؑ نے اصحاب
کہہ کر جواب نہیں دیا۔ یہ بھی عجیب بات ہے اور عجیب اتفاق
ہے کہ ہر دو آیت کے یہ لفظ صاحب، اصحاب ہر جگہ اس
موقع کے ہیں کہ جب کفار ان ساتھ والوں سے قریب تر ہو
گئے ہیں اور یہ دشمنوں کے قریب آجانے سے خوف زدہ
ہیں اور دونوں جگہ دونوں نبیؑ اطمینان بخش کلمات فرما کر اطمینان
دلا رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ سے جب ان کے ساتھ
والوں نے کہا "ہم یقیناً پکڑے گئے" تو حضرت موسیٰؑ نے
فرمایا۔ کَلَّا۔ ہرگز نہیں (پکڑے جا سکتے) کیوں! اس

لیے کہ اِنَّ مَعِی رَبِّی سَیَھدِین۔ میرے ساتھ میرا
خدا ہے۔ وہ مجھے (دریا میں) راستہ دے گا۔ موسیٰ علیہ السلام
کے ساتھ والوں نے اپنے پکڑے جانے کو یقینی اس لیے سمجھ
لیا تھا کہ ادھر تو فرعون مع لشکر کے ان کے قریب پہنچ گیا
جس کو بقولِ قرآن انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور ادھر
ان لوگوں کے آگے تھا دریا۔ یہ آگے قدم نہ بڑھا سکتے تھے۔
اس لیے دشمن کے ہاتھوں پکڑ جانا خود یقینی ہو گیا جس کا
انھوں نے اظہار کیا تو نبیؐ نے ان سے کہا کہ تم ہرگز نہ پکڑے
جاؤ گے کیونکہ میرے ساتھ میرا خدا ہے۔ وہ مجھے (دریا میں)
راستہ دے گا۔ یہ کلمہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے ساتھ والوں کے
اطمینان کے لیے فرمایا لیکن یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ان
لوگوں کو حضرت موسیٰ کے اس کلمہ سے کیسے اطمینان ہو سکا
جو کلمہ موسیٰؑ نے صرف اپنی ذات کے لیے کہا تھا کہ میرا خدا
میرے ساتھ ہے وہ مجھے راستہ دے گا قوم کہہ سکتی تھی کہ
آپ کا خدا آپ کے ساتھ ہے وہ آپ کو راستہ دے گا

تو ہم کو کیا؟ ہم تو پکڑے ہی گئے لیکن نہیں قوم سمجھ گئی کہ
خدا موسیٰ کے ساتھ ہے وہ موسیٰ کو راستہ دے گا
ہم چونکہ اس وقت موسیٰ کے ساتھ ہیں اس لیے خدا ہمارے
بھی ساتھ ہے۔ خدا موسیٰ کو راستہ دے گا چونکہ اس وقت
ہم موسیٰ کے ساتھ ہیں لہٰذا وہ راستہ ہم کو بھی ملے گا۔ اگر
ہم موسیٰؑ کے بغیر ہوتے تو نہ خدا ہمارے ساتھ ہوتا نہ وہ
ہم کو راستہ دیتا۔ اب جو کچھ ہوگا موسیٰؑ کی بدولت ہوگا۔ خود
حضرت موسیٰؑ کا یہ فرمانا کہ میرا خدا میرے ساتھ ہے وہ
مجھے راستہ دے گا اسی مقصد سے تھا کہ میرا خدا میرے
ساتھ ہے وہ مجھے راستہ دے گا چونکہ تم اس وقت میرے
ساتھ ہو لہٰذا میرا خدا تمھارے بھی ساتھ ہے اور دیا جانے
والا راستہ تم کو بھی ملے گا۔ جو مفہوم یہاں جناب موسیٰؑ
کے قول کا ہے وہی مفہوم ہمارے نبیؐ کے اس قول کا ہے
جو آنحضورؐ نے اپنے ساتھ والے سے فرمایا۔ کیونکہ دونوں
نبیؐ ہیں اور ایسے باہم مشابہ ہیں کہ اللہ نے سورۂ

مزمل میں نبیؐ آخر کو اسی نبی یعنی موسیٰؑ سے تخصیصاً تشبیہ
دیتے ہوئے فرمایا انا ارسلنا الیکم رسولا شاھدا
علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولا۔ آنحضورؐ کے
ارشاد ان اللہ معنا کا مفہوم بھی بالکل وہی ہے جو
مفہوم جناب موسیٰؑ کا تھا کہ میرے ساتھ ہونے کی وجہ سے
اللہ تمھارے بھی ساتھ ہے اور میری حفاظت کے ساتھ وہ تمھاری
بھی حفاظت کرے گا۔ اللہ کی اصل معیت نبی کے لیے ہے
لیکن دونوں نبی کے طرز کلام میں یہ فرق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام
نے بغیر کسی رو رعایت کے فرمایا کہ میرا خدا میرے ساتھ ہے
وہ مجھ کو راستہ دے گا یہ نہیں فرمایا کہ ہمارا خدا ہمارے ساتھ
ہے وہ ہم سب کو راستہ دے گا لیکن ہمارے نبی چونکہ
اخلاقِ حسنہ میں موسیٰ بلکہ ہر نبی سے فائق ہیں۔ آپ کے
خلق کو خدائے عظیم نے خلقِ عظیم فرمایا ہے۔ لہٰذا آنحضورؐ نے
اس مفہوم کو اپنے کمال خلق کی بنا پر اس طرح بیان فرمایا کہ اللہ
ہمارے ساتھ ہے اگر آنحضورؐ بھی جناب موسیٰؑ کی طرح وہی لفظ

فرماتے کہ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ وہ میری حفاظت کریگا
تو یہ غلط نہ ہوتا کیونکہ اللہ کی اصل معیت جو کسی اور کی
بدولت نہ ہو۔ صرف نبی ہی کے لیے ہے۔ اس معیت کی
وسعت میں دوسرے بزرگوار نبی کے اس وقت ساتھ ہونے
کی وجہ سے ہیں۔ اس وقت نبیؐ کے ساتھ یہ بزرگوار تھے
لہٰذا اللہ کی معیت اور حفاظت میں نبیؐ کے ساتھ یہ بزرگوار
شامل ہوئے اگر کوئی اور بزرگ ہوتے مثلاً حضرت عمر
ہوتے یا حضرت عثمان یا حضرت زبیر یا کوئی بھی بزرگ
ہوتے تو ان کے لیے بھی یہی لفظ ہوتا۔ غرضکہ ہم یہ کہہ رہے
تھے کہ لفظ اصحابِ موسیٰؑ یہ بتلانے کے لیے کہا گیا ہے کہ ہم
پکڑے گئے یہ لفظ انھوں نے کہا تھا جو موسیٰ کے اس وقت
ساتھ تھے یہ لفظ ان لوگوں کی نہ قوتِ ایمانی دکھانے کے
لیے کہا گیا نہ ان کے اخلاص و وفاداری ثابت کرنے کے
لیے کہا گیا نہ ان کی فرماں برداری ظاہر کرنے کے لیے کہا گیا
یہی موسیٰؑ کے ساتھ والے (اصحابِ موسیٰؑ) ہیں کہ جیسے ہی

اللہ نے ان لوگوں کو بحرِ ذخار میں راستہ دے کر پار اتار دیا
اور ان کے تمام دشمنوں کو ان کے دیکھتے ہی غرقِ آب کر دیا
ویسے ہی ان لوگوں نے بجائے شکرِ خدا ادا کرنے کے اور
قوتِ ایمانی بڑھانے کے یہ غضب ڈھایا کہ اور کسی سے
نہیں اپنے نبیؐ سے یہ فرمائش کی کہ اے موسیٰ جیسے کہ بت
پرستوں کے اصنام اور بہت سے خدا ہیں۔ ایسا ہی ایک
خدا ہمارے لیے بنا دیجیے۔ لما جاوزنا ببنی اسرائیل
البحر اتت علیٰ قوم یعکفون علیٰ اصنام لھم
قالوا یا موسیٰ اجعل لنا الٰھًا کما لھم آلھۃ
جب ہم نے بنی اسرائیل کو دریا کے پار اتار دیا تو ان کا گزر
ایسی قوم کی طرف ہوا جو اصنام کی پرستش کے لیے جمے
بیٹھے تھے (یہ دیکھ کر) بنی اسرائیل (جنکو ابھی اصحاب
موسیٰ کہا تھا) بولے اے موسیٰ جیسے ان کے خدا ہیں
ایک خدا ایسا ہی ہمارے لیے بنا دیجیے۔ قال بل
انتم قوم تجھلون۔ موسیٰؑ نے فرمایا کہ تم تو

نری جاہل قوم ہو۔ موسیٰ علیہ السلام تو کیسے کوئی خدا
اور رب بنا سکتے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں
کے دل سے یہ آرزو نکلی نہیں۔ یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام
کی غیر موجودگی میں جبکہ قوم کے درمیان میں حضرت موسیٰ کی واپسی تک
حضرت ہارونؑ ان کے جانشین تھے۔ سامری نے ان کی دیرینہ
آرزو کو پورا کر دیا۔ اور گوسالہ بنا دیا جسکی یہ پوجا کرنے لگے۔
حضرت ہارونؑ نے لاکھ لاکھ روکا مگر یہ نہ رکے۔ حضرت ہارون
کی بات کو ماننا کیا ان کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ حالانکہ حضرت
موسیٰ زندہ موجود تھے اور صرف تیس چالیس روز کے لیے اپنی قوم سے
جدا ہو کر کوہِ طور پر عبادتِ خدا کر رہے تھے۔ چنانچہ جناب
موسیٰؑ نے واپس آکر دیکھا کہ یہ لوگ گوسالہ سامری کے پرستار
ہیں۔ حضرت ہارون سے بازپرس کی تو انھوں نے اپنے ماں جائے
سے کہا انّ القوم استضعفونی وکادوا ان یقتلونی
بھائی جان (آپ کے پیچھے) قوم نے مجھے کمزور کر دیا۔ یہ لوگ
تو مجھے قتل ہی کیے دیتے تھے۔ یہی بنی اسرائیل تھے جنھوں نے

اللہ کے اس حکم پر کہ تم دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل
ہوا اور حطۃ کہو تو ہم تمھارے گناہوں کو بخش دیں گے۔ انھوں
نے حکم خدا کا استہزاء کر کے حطۃ کہنے کی بجائے حنطۃ (گیہوں)
کہا۔ کہ ہم کو بخشش گناہ نہیں چاہیئے۔ ہم کو تو گندم چاہیے۔
فبدّل الذین ظلموا قولا غیر الذی قیل لھم
ان ظالموں سے جو بات کہی گئی تھی انھوں نے اسکو بدل ڈالا
یہی بنی اسرائیل ہیں جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم تو آپ پر
ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک کھلم کھلا اللہ کو نہ دیکھ لیں جس
سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اب تک مومن ہی نہ تھے حالانکہ اب سے
بہت پہلے ان ہی کو اصحابِ موسیٰؑ کہا جا چکا تھا۔ یہی بنی اسرائیل
ہیں جنھوں نے اترتی ہوئی اللہ کی نعمت (من و سلویٰ) کو ٹھکرایا۔
اور کہا کہ اے موسیٰ ہم ایک ہی کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے
یہی بنی اسرائیل ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ملعون اور کافر کہا ہے۔
لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل الخ
یہی بنی اسرائیل ہیں جن سے حضرت موسیٰؑ نے فرمایا۔ یٰقوم ادخلوا

الارض المقدسة التی کتب اللہ لکم ولا ترتدوا
علیٰ ادبارکم فتنقلبوا خاسرین۔ "اے میری
قوم اس ارضِ مقدس میں داخل ہو جسکو اللہ تمہارے لیے
لکھ چکا ہے اور پیٹھ دکھا کر مت پلٹو ورنہ تم زیاں کار ہوگے۔"

اب اس کا جواب جو قوم نے دیا وہ بھی سنیے ؛۔

قالوا یا موسیٰ ان فیہا قوماً جبارین وانا
لن ندخلہا حتیٰ یخرجوا منہا فان یخرجوا
منہا فانا داخلون ۔

بنی اسرائیل (اصحابِ موسیٰ) بولے اس شہر میں بڑے
طاقتور لوگ ہیں۔ ہم تو اس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے جب تک
وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ اگر وہ وہاں سے نکل جائیں گے
تو ہم بیشک داخل ہوں گے"

قال رجلان من الذین یخافون انعم اللہ
علیہما ادخلوا علیہم الباب فاذا دخلتموہ فانکم
غالبون وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین

"دو شخص جو خدا سے ڈرتے تھے جن کو اللہ نے ایمان
کی دولت دی تھی بولے کہ لوگو دروازہ میں داخل ہو کر اپنے
دشمنوں پہ چڑھائی تو کرو۔ جب تم داخل ہو جاؤ گے تو
غالب تم ہی آؤ گے۔ تم لوگ اللہ پہ بھروسہ کرو اگر تم مومن ہو۔"

اس کا جواب بھی ملاحظہ فرمائیے ؛۔

قالوا یا موسیٰ لن ندخلہا ابداً ما داموا
فیہا فاذہب انت وربک فقاتلا انا ھھنا
قاعدون ۔" بنی اسرائیل نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز
اس سرزمین میں داخل نہ ہوں گے جب تک ہمارے مخالف
وہاں ہیں۔ تم اور تمہارا خدا تم دونوں جاکر ان سے قتال
کرو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں "

اب حضرت موسیٰ اپنے معبود سے کہتے ہیں :۔

قال یا رب انی لا املک الا نفسی واخی فافرق
بیننا وبین القوم الفاسقین ۔

"موسیٰ نے کہا اے میرے رب میرے بس میں ہاں تو میری

جان ہے یا میرا بھائی (ہارون) ہے پس تو ہم دونوں کے اور اس فاسق قوم کے درمیان جدائی کر دے۔"

جن کا خاکہ ہم نے قرآنِ کریم کی رو سے کھینچا ہے یہ وہی لوگ ہیں جن کو موسیٰؑ کے ساتھ والے (اصحاب موسیٰؑ) سابق میں کہا جا چکا تھا۔ کیا اب بھی اس میں کوئی شک ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے شرفِ ایمانی، دینداری اور فرماں برداری کی بناء پر ان کو اصحابِ موسیٰ نہیں کہا گیا تھا اور اصحاب موسیٰؑ کا ان کو لقب نہیں دیا گیا تھا۔ بلکہ صرف موسیٰؑ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ان کو موسیٰؑ کے ساتھ والے کہا گیا تھا۔ یہ ہے قرآنی لفظ اصحابِ موسیٰؑ کی حقیقت۔ اب یہ لفظ صحابہ استعمال ہو رہا ہے شرف و منقبت کے لیے ان کے ایمان و عرفان، جان نثاری اور فرمانبرداری کے مفہوم میں جبکہ قرآنِ کریم نے اس مفہوم کو لے کر ہرگز ہرگز بنی اسرائیل کو اصحابِ موسیٰ نہیں کہا۔ قرآنِ کریم نے تو اصحابِ موسیٰؑ کہہ کر ان کی وہ مذمت کی ہے کہ توبہ بھلی۔ کونسا لفظ مذمت ہے اور عنوانِ مذمت ہے جو رہ گیا ہو۔ جاہل، ظالم، فاسق، ملعون،

کافر، گوسالہ پرست، ہارون نبیؑ کے قتل کرنے کی ٹھان بیٹھنے والے، قول مامور بہ کو بدل دینے والے، حکمِ جہاد سے منحرف، موسیٰؑ ہم تم کو ہرگز نہ مانیں گے جب تک کھلم کھلا اللہ کو نہ دیکھ لیں کہنے والے، موسیٰؑ سے بت کی طرح کا خدا بنوانے کی فرمائش کرنے والے، موسیٰؑ تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو کہنے والے وغیرہ ذالک۔

میں ہرگز یہ نہیں مان سکتا کہ ہمارے نبیؐ کے جان نثار صحابہ ایسے ہی تھے، جیسے اصحابِ موسیٰؑ۔ اس لیے میں پُرزور دعویٰ کرتا ہوں کہ ہمارا لفظ اصحابِ نبیؐ کا استعمال ہرگز ہرگز قرآنی نہیں ہے سراسر غیر قرآنی ہے۔ آپ اپنے اس لفظ کو قرآنی کہہ کر فدا کارِ صحابۂ نبیؐ کو کیا وہ سب کچھ بنانا گوارا کر رہے ہیں جو اصحاب موسیٰؑ بنے۔ افسوس ہے کہ ہمارے مخاطب تحفہ نمبر کے ص۵۵ پر فرماتے ہیں کہ "لفظ صحابہ کا مروجہ مفہوم قرآنِ کریم کے عین مطابق ہے خلاف نہیں۔" اب دنیائے اسلام دیکھ لے کہ مخاطب محترم لفظ صحابہ کو قرآنِ کریم کے عین مطابق یعنی

اصحابِ موسیٰ ؑ کے عین مطابق ؟" فرما کر صحابہ کی کیا خدمت کر رہے ہیں اور ان کو کیا کیا کچھ بنا رہے ہیں۔ ہمارے مخاطب محترم کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"قال اصحاب موسیٰ انا لمدرکون ۲۶/۶۱ موسیٰ ؑ کے صحابہ اصحاب صحابیوں نے کہا کہ بے شک ہم پکڑے جانے والے ہیں۔ اس ایک آیت ہی نے ثابت کر دیا ہے کہ لفظ صحابہ کا مروجہ مفہوم قرآنِ کریم کے عین مطابق ہے، خلاف نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہجرت کرنے والوں سب کو اصحابِ موسیٰ ؑ کہا گیا ہے جن میں وہ لوگ بھی تھے جو تحریکِ موسوی میں آگے نکل کر کام کرنے والے تھے اور وہ بھی جو پیچھے لگنے والے تھے۔ اسی طرح بلا امتیازِ مراتب، صحابۂ رسول سلام ؑ علیہ کو صحابی، اصحاب یا صحابہ کہا جاتا ہے جو عین منشاءِ الٰہی کے مطابق ہے۔" مکرر فرماتے ہیں:۔

"کیونکہ جن معنوں میں لفظ (صحابہ) مروج ہے ان ہی معنوں میں قرآن کریم میں آیا ہے۔"

مختصر یہ کہ ہمارے مخاطب ؑ یہ طے کر رہے ہیں کہ جن معنوں میں بنی اسرائیل اصحاب موسیٰ تھے ان ہی معنوں میں عہدِ رسول کے مسلمان اصحابِ رسول ؑ ہیں جیسے وہ تھے ایسے ہی یہ ہیں جس جس طرح کے لوگ ان میں تھے اس اس طرح کے لوگ اصحابِ رسول ؑ میں بھی ہیں۔ بنی اسرائیل میں کیسے کیسے تھے، اصحابِ موسیٰ ؑ نے کیا کیا کچھ کیا تھا۔ یہ دیکھیے آیات قرآنیہ میں اور پھر اس طرح کے لوگوں کو اصحابِ رسول ؑ میں دیکھتے جائیے۔ وہاں کی ہر قسم یہاں مل جائے گی۔ یہ ہے تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر۔

ہم نے اپنے کتابچہ "صحابیت کا قرآنی تصور" میں لکھا تھا کہ فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والوں کو آنحضور ؑ نے جنگِ حنین کی غنیمت کا زیادہ حصہ بنظرِ تالیفِ قلوب عطا فرمایا تھا۔ ہمارے اس جملہ پر فاضل مخاطب لکھتے ہیں:۔

"آنحضور ؑ کے اس فعل سے بھی ان کا ایمان ثابت ہے"

اگر آنحضور ؑ کے اس فعل سے ان کا ایمان ثابت ہے

تو آیت مندرجہ ذیل کن لوگوں کے لیے ہے، غور سے پڑھیے:۔

وما نقموا الا ان اغناهم الله ورسوله من
فضله فان یتوبوا یک خیرا لهم وان یتولوا
یعذبهم الله عذابا الیما فی الدنیا والآخرة

"اور نہیں برائی کی ان لوگوں نے مگر اس لیے کہ اللہ اور
رسولؐ نے ان کو اپنے فضل سے مالدار کر دیا وہ توبہ کر لیں تو
ان کے لیے اچھا ہے ورنہ اللہ ان کو دنیا اور آخرت میں
دردناک عذاب دے گا"

ہم نے "صحابیت کا قرآنی تصور" میں کہا تھا کہ نبیؐ نے
اس جماعت کو (فتح مکہ کے بعد والے مکی) جو ہر طرح سخت
سزا کی مستوجب تھی۔ اذهبوا انتم الطلقاء فرما کر رہا
کر دیا۔ اس پر فاضل مخاطب فرماتے ہیں:۔

"محترم مقالہ نگار نے یہ کہہ کر کہ وہ ہر طرح سخت سزا
کے مستوجب تھے۔ نبی اکرمؐ نے انھیں رہا کر دیا، ایک نہایت
ناگفتہ بہ تصور پیش فرمایا ہے۔ فحاشی کے مرتکب جوڑے کے

متعلق حکم باری ہے۔ ولا تأخذکم بهما رافة الخ۔ اگر
تم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو تو ان دونوں کو سزا دینے
میں تمھیں رحم نہیں آنا چاہیے۔ اب بات بالکل صاف ہے اگر
فتح مکہ کے وقت لوگ اس سزا کے مستوجب ہوتے جس کی
نشاندہی سخت سزا کے الفاظ میں محترم مقالہ نگار نے کی
ہے تو ہو نہیں سکتا کہ حضور منشاء خداوندی کی خلاف ورزی کرتے
ہوئے مجرموں کو سزا دینے کی بجائے غنیمت کے انعامات سے نوازتے۔"

معاصر عزیز فحاشی وغیرہ یہ جرائم اور چیز ہیں اور جرم کفر و
نفاق اور چیز ہے۔ کفار اور منافقین کی اذیت رسانی پر نبیؐ کو بجا
حکم خدا ہے کہ چھوڑ دو، تعرض نہ کرو، درگزر کرو۔ چنانچہ سورۂ احزاب
رکوع ۶ ۔ میں ارشاد فرمایا ہے کہ ولا تطع الکافرین والمنافقین
ودع اذاهم وتوکل علی الله وکفی بالله وکیلا

"اے رسولؐ کفار اور منافقین کی اطاعت تو ہرگز نہ کرنا۔ رہی
ان کی اذیت رسانی اس کو چھوڑ دو، اور اللہ پر توکل کرو، اللہ
وکیل کی حیثیت سے کافی ہے۔"

پھر سورۂ توبہ میں ارشاد ہے۔ سیحلفون باللہ لکم اذا انقلبتم الیھم لتعرضوا عنھم فاعرضوا عنھم الخ "منافقین تمھاری واپسی پر اللہ کی قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے کوئی تعرض نہ کرو، پس تم ان سے تعرض نہ کرو۔"

لہٰذا نبیؐ نے سخت سزا کے مستوجب لوگوں کو منشائے خداوندی کے تحت چھوڑا۔ آپ کے اعراض کا شانِ نبوت پر کوئی اثر نہیں، اللہ کا نبیؐ آپ کی یا کسی کی رائے کا ماننے والا نہیں وہ اللہ کے حکم کا مطیع ہے۔ اللہ تو نے تو طے کر دیا ہے کہ اس دنیا میں کفر و نفاق کی کوئی سزا نہ دی جائیگی۔ لا اکراہ فی الدین لیکن فحاشی کی سزا ایک انتظامی چیز ہے اس کو عفو نہیں کیا جا سکتا بلکہ فحاشی تو فحاشی عورتوں سے چھیڑ خانی پر بھی منافقین وغیرہم کو سخت تہدید کی گئی ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔

ہمارے مخاطب رقم طراز ہیں۔

"تاریخ کہتی ہے کہ یہ، وہ لوگ تھے (فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے اہلِ مکہ) جنھوں نے حضرت علیؑ کے دورِ خلافت

میں بغاوت کی اور جنگِ صفین کا معرکۂ کارزار گرم کیا۔ اس تصور اور مقالہ نگار کی نشان دہی کے مطابق بات یہ نبی ہے کہ وہ لوگ صرف سخت سزا ہی کے مستوجب نہیں تھے بلکہ انھیں رہا کر دینا، سزا نہ دینا اور انھیں حضرت علیؑ کی راہ میں کانٹے بکھیرنے کے لیے زندہ رہنے دینا معاذ اللہ معاذ اللہ خود کردارِ رسولؐ تھا۔"

جواباً عرض ہے کہ ان کو سزا نہ دینا اور ان سے درگزر کر کے زندہ چھوڑ دینا یہ رسولؐ کا اپنا ذاتی عمل تو نہیں ہے اس کے تو اللہ نے اپنے نبیؐ کو حکم دیا۔ دع اذاھم۔ فاعرضوا عنھم۔ حکمِ خدا کی موجودگی میں نبیؐ پہ تو کوئی الزام آ ہی نہیں سکتا۔ البتہ آپ خدا سے کہیے کہ تو نے ایسے خبیث لوگوں کو پیدا کر کے جنھوں نے ایک حضرت علیؑ ہی کی راہ میں نہیں بلکہ تمام انبیاء کی راہ میں کانٹے بکھیرے ہزاروں انبیاء اور خاصانِ خدا کو قتل کیا۔ ہزاروں مستورات کی عصمت دری کی، ہزاروں کا حق چھینا، فساد پھیلائے۔ تیرا

شیطان کو پیدا کرنا اور دنیا بھر کو گمراہ کرنے کا اسکو موقع دینا ان سب کو تیرا پیدا کرنا اور زندہ چھوڑ دینا، تیرا یہ اپنا کردار ہے۔ ان سب باتوں کا سبب تو خود ہوا۔ میرے دوست یہ دنیا دار امتحان ہے۔ جب تک نیکی بدی کا موقع نہ دیا جائے نیک کی نیکی، بد کی بدی ظاہر کیسے ہو اور جنتی، دوزخی ہونے کا فیصلہ کس بنا پر ہو۔ یہ دنیا عبوری دور ہے۔ منزل تو وہ ہے جو آ رہی ہے۔ راہ علیؑ میں کانٹے بکھیرنے والوں کے لیے وہاں کانٹے اور عقیدت کے پھول نچھاور کرنے والوں کے لیے وہاں باغ رضوان ہے۔

مخاطب محترم فرماتے ہیں:۔

"آنحضورؐ کی جو سیرت قرآن مجید میں درج ہے اس سے تو ہمیں انکار نہیں البتہ وہ سیرت جو قرآن کریم کے خلاف دکھائی دیتی ہے کہ آنحضورؐ نے ایک چھ سالہ لڑکی سے شادی فرمائی تھی، ایک وقت گیارہ عورتوں سے نکاح کیا تھا اور آپ کے ہاں لونڈیاں بھی تھیں

ایسی سیرت سے یقیناً یقیناً ہمیں انکار ہے"

جو سیرت خلاف قرآن ہے وہ آنحضورؐ کی سیرت ہی نہیں ہے اسکو کوئی بھی مسلمان قبول نہیں کر سکتا اگر وہ مسلمان ہے۔ لہٰذا چھ سالہ لڑکی سے شادی کرنے کی روایت کو تو آپ جانیں اور آپ کے راوی جانیں، ہمارا عقیدہ تو ہے کہ سورت قرآن جس کا نام ہے وہ سیرت آنحضورؐ ہے۔ اور سیرت آنحضورؐ وہ ہے جس کا نام قرآن ہے۔ رہا گیارہ عورتوں سے آپ کا بیک وقت نکاح فرمانا یہ کسی نے بھی بیان نہیں کیا کہ گیارہ عورتوں سے ایک دن یا ایک جلسہ میں آنحضورؐ نے نکاح فرمایا تھا۔ یہ نکاح مختلف زمانوں میں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے مصالح نبوت و ہدایت کی بنا پر اپنے رسول کو ازواج اربعہ کی قید سے مستثنیٰ قرار دیا تھا اور اس استثنا کو خصائص نبویہ میں سے قرار دیا تھا۔ ورنہ حضور اکرمؐ نے اپنی نبوت کے پہلے دور میں اپنی پوری جوانی پچاس سال کی عمر مبارک تک صرف ایک ہی زوجہ جناب خدیجۃ الکبریٰ کے ساتھ بسر کی

ان کی موجودگی میں گیارہ تو درکنار عقدِ ثانی کا بھی ارادہ نہ فرمایا
یہی صورتِ حال علی مرتضیٰؑ اور فاطمہ زہراؑ کی ہے - جناب
خدیجۃ الکبریٰ کی وفات کے بعد آنحضورؐ نے متعدد نکاح فرمائے
لیکن ہمیشہ جناب خدیجۃ الکبریٰ کا ذکرِ خیر فرماتے رہے اور
ان کے محاسن و مکارم، وفاداری، غم خواری کو یاد فرماتے
رہے - اگر کسی زوجہ کو یہ ذکر ناگوار بھی گزرا تو آپ نے اس
ناگواری کی کبھی پروا نہ کی - جواباً فرماتے تھے کہ خدیجہ جیسی مجھے
کوئی زوجہ نہیں ملی - تم میں سے کوئی بھی ان کی برابری نہیں کر سکتا
کیا عجب ہے کہ مدینہ میں تشریف لا کر آنحضورؐ نے اپنے اس
تعددِ ازدواج سے یہ چیز عملاً بھی ظاہر فرمائی ہو کہ جو اطمینان و
سکون و اعتماد مجھے خدیجہ کے بارہ میں تھا - اگر ایسا ہی سکون و
اعتماد و اطمینان مجھے کسی زوجہ کے بارے میں ہوتا تو جس طرح
میں نے خدیجہ کی موجودگی میں دوسرا عقد نہیں کیا تھا اسی طرح
اس زوجہ کی موجودگی میں بھی پھر دوسرا عقد نہ کرتا - رسولؐ کے عمل
سے اس بیّن شہادت کی موجودگی میں بھی اگر کوئی سازش

رسولؐ کے کسی زوجہ سے غیر معتدل عشق و محبت کے افسانے
گھڑ ڈالے اور دشمنانِ رسولؐ سے رنگیلا رسول لکھوانے کا موقع
دے دے تو یہ محض مذہبی سیاست کا جنون ہوگا - دنیا نے
اس پر غور ہی نہیں کیا کہ فراوانیٔ عشق و محبت کے یہ نام نہاد
افسانے آنحضورؐ کی اس ازدواجی زندگی کے مطلقاً نہیں ہیں
جبکہ آنحضورؐ کا شباب تھا اور آپ کی زوجیت میں صرف جناب
خدیجہ تھیں - اگر اس قسم کے افسانوں میں عجمی سازش کا ہاتھ ہوتا
تو یہ افسانے جناب خدیجۃ الکبریٰ سے کمال محبت دکھانے
کے لیے گھڑے گئے ہوتے نہ کہ کسی اور زوجہ سے ، کیونکہ
اہلِ عجم کے مسلک کو صرف اسی معظمہ سے مخصوص وابستگی تھی -
یہ معظمہ علی مرتضیٰؑ کی خوشدامن ، فاطمہ زہراؑ کی ماں اور امام
حسنؑ و حسینؑ کی نانی تھیں - اگر اہلِ عجم اپنے ائمہ کی حمایت میں
رسولؐ کی غیر معتدل محبت کے افسانے گھڑتے تو جناب
خدیجہ کے بارے میں گھڑتے - اہلِ عجم سے ایسے افسانے
نبیؐ کی کمالِ محبت دکھانے کے لیے کسی اور زوجۂ نبیؐ کے باب

ہیں جن سے ان کے مذہب کا کوئی مخصوص اور نمایاں لگاؤ نہیں ہے کیوں تراشتے۔ ایک طرف تو اہلِ عجم کا یہ دعویٰ کہ جو محبت خلوص اور اعتماد وسکون آنحضورؐ کو جناب خدیجہ سے تھا وہ کسی بھی زوجہ سے نہ تھا اور دوسری طرف وہ رسولؐ کی انتہائی محبت اور والہانہ کیفیت دکھائیں کسی اور زوجہ سے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ افسانوں کا یہ عنوان خود بتا رہا ہے کہ یہ سازش کسی اور طرف سے ہے ورنہ کوئی دکھا دے کہ ایسے افسانوں میں جناب خدیجۃ الکبریٰ سلام علیہا کا کہیں نام تک آیا ہے۔ یہ سازش اسی طرف سے ہو سکتی ہے جس طرف سے امام حسن علیہ السلام کے بارہ میں سو، ساٹھ یا پچاس عورتوں سے نکاح وطلاق کے نام سے ہوئی اور اس سازش کو سنّی الشیعہ سب کے کانوں میں پھونک دیا گیا۔ معاذ اللہ تاریخ میں کہیں یہ نہ ملے گا کہ آنحضورؐ دعوتِ طعام کو شرکتِ خدیجہ کے بغیر منظور کرنا پسند نہ فرماتے تھے۔ نہ کہیں یہ ملے گا کہ سرکار اور ان

کی زوجہ خدیجۃ الکبریٰ ایک ظرف میں ایک ساتھ نہاتے تھے۔ نہ یہ ملے گا کہ سرکار اپنے کاندھے پر سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ کو حبشیوں کا کھیل دکھاتے تھے۔ نہ یہ ملے گا کہ سرکار حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے دہن اقدس کی نرم کی ہوئی مسواک استعمال فرماتے تھے، وغیر ذالک۔

ہم نے قرآن مجید سے بطور مثال کچھ آیات پیش کی تھیں جن میں عہدِ پیغمبرؐ کے مومنین مخلصین کی اللہ تعالیٰ نے مدح وستائش فرمائی ہے۔ اسی طرح ہم نے کتابچہ صحابیت کا قرآنی تصور میں بطورِ مثال ان آیات کو پیش کیا تھا جن میں عہدِ پیغمبر کے مدعیانِ اسلام کی انتہائی مذمت ہے۔ دونوں قسم کی آیات پیش کر کے ہم نے دکھایا تھا کہ چونکہ عہدِ مقدس نبوی میں دو قسم کے کلمہ گو تھے جہاں اچھے سے اچھے حضرات تھے وہاں بدتر سے بدتر لوگ بھی تھے۔ اس لیے ان کا قرآنی ذکر بھی دو مختلف انداز میں ہوا۔ کچھ کی انتہائی مدح اور کچھ کی انتہائی مذمت جس سے ہمارا

مطلب بالکل واضح طور پر یہ تھا کہ کلماتِ مدح کو دیکھ کر
ہر ایک کو بغیر پرکھے ممدوحِ قرآن نہ سمجھ لیا جائے جیسے
کہ ہمارے مخاطبِ محترم نے آیت کے لفظ اشداء علی الکفار
کو دیکھ کر آیت کی مدح میں ان بعض ان حضرات کو بھی
سمجھ لیا جو فتح مکہ کے بعد کسی طرح مسلمان ہو گئے۔ حالانکہ
آیتِ مذکورہ کے نزول کے وقت وہ لوگ اشداءُ علی الکفار
نہ تھے۔ بلکہ خود کفار تھے اور اشداء علی الرسولؐ والمومنین
تھے اس لیے یہ غلط ہے کہ قرآن نے جو مدح نام کے
بغیر کی ہے اور محض صفات پر فرمائی ہے اس مدح کو
ان لوگوں پر چسپاں کر دیا جائے۔ جن میں وہ صفات
نہیں ہیں جیسے کہ یہ غلط ہے کہ قرآن کی مذمت جو
نام کے ساتھ نہیں ہے صفات کے ساتھ ہے اس مذمت
کو ان حضرات پر چسپاں کر دیا جائے جن میں وہ صفاتِ
مذمت نہیں ہیں اور یہ طے کرنا کہ صفاتِ مدح کن حضرات
میں پائے جاتے ہیں اور صفاتِ مذمت کن لوگوں

میں ہیں یہ کسی طرح بھی قرآنِ کریم سے دریافت نہیں ہو سکتا
اس امر کو بتانے والی تاریخ اور صرف تاریخ ہے جس کے
اصل مورخ خود نبیٔ اکرمؐ ہیں اور ان کے ساتھ ان کے اہلبیتؑ
اور ان کے عہد کے مسلمان ہیں۔ تاریخی بیان کے وہ
پہلو جو مختلف فیہ ہو کر کمزور ہو گئے ہیں۔ ان کو بغیر تحقیق کے
آمنّا وصدّقنا نہیں کہا جا سکتا۔ اس پہلو کے مقابلہ میں تاریخ
کا وہ پہلو بھی ہے جو بلا اختلاف ہے وہ تاریخ کے مسلمات
ہیں۔ ان تاریخی مسلمات کو جھٹلانا بے عقلی ہے یہ ہمارا دینی
اساس ہے اور ہمارے دینی اصول و فروع کی شہ رگ
ہے۔ ان مسلمات کو مومن تو مومن غیر مسلم اور کافر بھی نہیں
جھٹلا سکتا۔ مسلمات تو ہیں ہی مسلمات عقلمند انسان ان
مسلمات ہی کی مدد سے مختلفات کو بھی آسانی سے طے کر لیتا ہے
اسکی مثال میں دیکھیے کہ قرآن مجید صرف اتنا کہہ کر خاموش
ہو گیا کہ جنگِ احد میں کچھ لوگوں نے ازراہِ دنیا طلبی نبیؐ کے
حکم کی نافرمانی کی وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ کچھ لوگوں نے

ازراہِ آخرت طلبی اپنی جگہ نہ چھوڑی۔ پھر تم لوگوں میں سے
کچھ میدان کو بھی چھوڑ گئے۔ جنھوں نے اوپر چڑھتے ہوئے
رسولؐ کی پکار کو بھی نہ سنا۔ اب کوئی قیامت تک بھی قرآن
کریم کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھنا چاہے اور قرآن کریم سے
پوچھنا چاہے کہ جنھوں نے نافرمانی کی وہ کون تھے؟ جنھوں نے
فرماں برداری کی وہ کون تھے جو میدان سے بھاگے وہ کون
تھے؟ جو ثابت قدم رہے وہ کون تھے۔ تو ہمارا یہ سوال
قرآن سے کرنا بے کار ہے۔ قرآن کریم کا جواب یہی ملتا
رہے گا کہ تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو۔ یا تو
وہ بتا سکتے ہیں کہ یہ واقعات خود جن کے تھے یا وہ بتا
سکتے ہیں کہ جن حضرات کی آنکھوں نے دیکھا تھا اسی ہی کا نام
"تاریخ" ہے۔ ہمارے مخاطب "تاریخ" کے مسلمات کے منکر
ہیں تاکہ معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہی نہ رہے اور
ان کو بجائے خود یہ موقع مل جائے کہ جس زیر کو چاہیں زبر کر
دیں اور جس زبر کو چاہیں زیر کر دیں جس قراری کو چاہیں

فراری بنا دیں اور جس فراری کو چاہیں قراری دکھا دیں۔
ہم نے آیاتِ مذمت قرآن مجید سے دکھاتے ہوئے کہیں بھی
یہ نہیں کہا کہ یہ آیات صحابہ کی شان میں ہیں لیکن ہمارے
مخاطب محترم نے بار بار یہ فرمایا ہے کہ جو آیات منافقین
کے بارہ میں ہیں ان کو صحابہ پر جڑ دیا کتنی پُر لطف بات
ہے کہ ہمارے موصوف جب لفظ صحابہ کہتے ہیں تو ہر رطب و
یابس کو ہر کس و ناکس کو جمع کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور جب
برے لوگوں کی قرآن تنقید کرتا ہے اور آیاتِ قرآن مذمت
کرتی ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ صحابہ کہاں ہیں یہ تو منافقین
ہیں۔ گھڑی میں ملا لیتے ہیں اور گھڑی میں الگ کر دیتے ہیں
بروئے قرآن انما المومنون الذین آمنوا باللہ و
رسولہ واذا کانوا معہ علی امر جامع لم یذہبوا
حتی یستاذنوہ (سورۃ نور) مومن صرف وہ ہیں جو اللہ
اور رسولؐ پر ایمان لائے اور جب کبھی بھی جہاد پر رسولؐ
کے ساتھ ہوئے تو وہاں سے ہرگز نہ گئے۔ میدانِ جہاد

سے نبیؐ کی اجازت کے بغیر چلے جانے والے مومن نہیں
ہیں چہ جائیکہ صحابی۔ ان کے عفو کر دیے جانے کے معنیٰ
یہ کہاں سے آ گئے کہ جو مومن نہ تھے وہ عفو ہوتے ہی
مومن بھی ہو گئے۔ اور برسوں کے بعد جب جنگ حنین
ہوئی تو پھر یہ لوگ چلتے بنے۔ ان اللہ یحب الذین
یقاتلون فی سبیلہ صفاً کانھم بنیان مرصوص
"اللہ محبت رکھتا ہے ان سے جو پرا باندھ کر اللہ کی راہ
میں قتال کرتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"
(سورۂ صف) آیت صاف بتا رہی ہے کہ جنگ سے
منہ موڑ کر کئی کئی دن کے لیے چلے جانے والوں سے اللہ
محبت نہیں رکھتا (ان کا صحابی ہونا تو درکنار رہا)
اگر ہمارے مخاطب صریح آیاتِ قرآنیہ کی روشنی میں یہ
فرما دیتے کہ ہم بھی ایسے لوگوں کو صحابی کیا مومن بھی صحیح معنیٰ
میں نہیں مانتے تو پھر کس کی ہمت تھی جو قرآن کریم سے صحابہ
کی مذمت کرتا اور مذمت دکھاتا۔ لیکن جب آپ خود

ہی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ان کو صحابہ ثابت کریں اور صحابہ
دکھائیں تو دوسرے پر آپ یہ اعتراض کیسے کر سکتے ہیں
کہ اس نے صحابہ پر طعن کیا۔ آپ خود دنیا کو موقع دے دے
کر لفظ صحابہ کی تنقیص کرا رہے ہیں وہ لفظ صحابہ لے رہا
ہے آپ سے اور مذمت لے رہا ہے قرآن کریم سے جس
طرح آپ آیات کا تجزیہ کرتے ہیں کہ یہ تو ہیں صحابہ کے
لیے اور وہ ہیں منافقین کے لیے۔ اسی طرح اس جماعت
کا بھی تو تجزیہ کریں کہ ان میں سے یہ لوگ تو ہیں مومن اور وہ
لوگ ہیں منافق جس طرح ہم نے اپنے کتابچہ سابقہ میں
پوری آزادی سے یہ لفظ لکھا ہے "مومنین کے علاوہ ایک
گروہ منافقین کا ہے جن کے ذکر سے قرآن بھرا پڑا ہے
لیکن ظاہر ہے کہ وہ صحابہ تو صحابہ وہ لوگ مومن بھی نہ
تھے" (صحابیت کا قرآنی تصور صفحہ ۳۶) اب دیکھیے کہ ہم صحابہ
کے وقار کو کیسا محفوظ کر رہے ہیں اور آپ جنگ سے
بھاگ جانے والوں کو منہ بھر بھر کر صحابی کہہ کہہ کر ان کے

وقار کو خاک میں ملا رہے ہیں۔ ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ ہر
ایسے ویسے کو صحابی نہ کہا جائے۔ لیکن آپ خود ان کو لتاڑ دیں
بھر رہے ہیں اور ان کے حصہ کی آیات کو الگ تھلگ رکھنا
چاہتے ہیں۔ ہمارے مخاطب بتائیں کہ ہم نے اپنے کتابچہ
صحابیت کا قرآنی تصور میں جہاں چودہ آیات مذمت بیان
کی ہیں کہیں ایک جگہ بھی لکھا ہے کہ یہ آیات صحابہ کی شان
میں ہیں یا ان آیات سے مراد صحابہ ہیں تو پھر ان کا یہ لفظا
کس طرف سے صحیح ہے کہ "ہمارے دوست نے منافقوں
والی آیتیں صحابہ رضی اللہ عنہم پر جڑ دی ہیں"۔ اگر ہمارے
موصوف کا یہ عتاب ہمارے کتابچہ کے پیش لفظ میں آئے
ہوئے جملہ پر ہے۔ "اسی قرآن میں بعض صحابہ کی ہجو، مذمت،
منقصت اور مطاعن کا جو متعدد آیات میں ذکر ہے" تو میں
عرض کروں گا کہ جناب خواجہ صاحب نے لفظ صحابہ کچھ اپنی
طرف سے تو نہیں کہا، انھوں نے تو یہ آپ ہی کا حد سے
زیادہ پھیلایا ہوا لفظ استعمال کیا ہے۔ آپ نے اپنے ہی

تحفظ ناموسِ صحابہ نمبر میں جنگِ اُحد سے متعلق تمام آیات
مذمت کو صحابہ پر جڑ دیا ہے اور آیات مذکورہ میں جن
لوگوں کی مذمت ہے ان کو صحابہ ٹھہرا دیا ہے لہٰذا
خواجہ صاحب نے یہ لفظ آپ ہی سے لیا ہے جس کو آپ
نے صدیوں سے عام کیا ہوا ہے کہ جس کو سابقین اولین،
مہاجرین، انصار کہیں جگہ نہ ملے وہ صحابہ کے خانہ میں
آ کر بیٹھ جاتے۔ جو لوگ رسولؐ کی زندگی میں، بیماری
میں، وفات میں، جنگ میں، صلح میں، کہیں ساتھ نہ
دیں، کہیں ساتھ نہ رہیں مگر ہیں صحابہ۔

ہماری پیش کردہ آیاتِ مذمت میں سے پہلی
آیت تھی۔ ولو انا کتبنا علیہم ان اقتلوا انفسکم او
اخرجوا من دیارکم ما فعلوہ الا قلیل منھم (سورہ نساء)
"اگر ہم ان لوگوں پر فرض کر دیتے کہ تم لوگ اپنے آدمیوں
کو قتل کر دو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو سوائے تھوڑے لوگوں
کے کوئی بھی ایسا نہ کرتا"۔ اس پر فاضل مخاطب نے نوٹ دیا ہے

"اور پیچھے" پ۹۱ میں صاف لفظ موجود ہے - رأیت المنافقین
جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ منافقین کی تعریف کی گئی ہے صحابہ
کی نہیں۔ عجیب بات ہے کہ خود ہی صحابہ میں منافقین کو شامل
کرتے جائیں اور گرفت کے وقت منافقین کو الگ کر دیں - یہ
کتنی غلط چیز ہے کہ اس پوری آیت کو منافقین سے مخصوص
کیا جا رہا ہے - آیت تو مومن منافق جس طرح موقع پر مخلوط
تھے - اسی طرح دونوں کو عام کہہ رہی ہے کہ اگر ہم ان لوگوں
پر یہ فرض کر دیتے کہ اپنے لوگوں کو قتل کر دیا اپنے گھروں سے
نکل جاؤ تو سوائے تھوڑے لوگوں کے کوئی بھی ایسا نہ کرتا - یہ
بہت سے لوگ جو تعمیل حکم نہ کرتے وہ تو ہوئے نافرمان یا منافق
مگر وہ تھوڑے لوگ جو تعمیل کرتے وہ کیسے ہوئے نافرمان یا
منافق؟ آپ نے ان قلیل پر بھی منافقت کا فتویٰ لگا دیا
جن کو خدا اپنے سنگین حکم کا بھی فرماں بردار کہہ رہا ہے - کہیں آپ
منافق کو مومن بناتے ہیں اور کہیں مومن کو منافق - آپ نے
آیت کے لفظ قلیل کو قلیل دقت کے لیے قلیل نظر سے

بھی نہ دیکھا لیکن کیوں نہ دیکھا ہم اس راز کو فاش کیے دیتے
ہیں صرف اس لیے کہ اگر آیت سے ہم فرمانبرداروں اور
نافرمانوں دونوں کو دکھاتیں تو ثابت ہو جائے گا کہ اکثریت بھی
نافرمانوں کی اور قلت تھی فرماں داروں کی لیکن اس پردہ پوشی
سے کام نہیں چلتا آیت صاف بتا رہی ہے کہ ہم اگر ایسا کوئی
بھاری اور سخت حکم دے دیتے تو قلیل کے سوا کوئی تعمیل نہ کرتا
لہٰذا اس عہد مقدس کی قلیل جماعت ہوئی - فرماں برداروں کی
اور کثیر ہوئی نافرمانوں کی اور صرف یہاں ہی یہ بات نئی
نہیں ہے - ہر زمانہ میں ہر نبی کے لیے یہی ہوا ہے - قرآن مجید
بیان کرتا ہے کہ سابق میں امت کا امتحان لیا گیا ایک نہر کے
پانی سے اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ سوائے ایک چلو پانی کے
کوئی پانی نہ پیے ورنہ وہ نافرمان قرار پائے گا لیکن ہوا کیا
فشربوا منه الا قلیلا منهم - معدودے چند لوگوں
کے سوا سب نے پی لیا پھر یہی لوگ آئے میدان جنگ میں
جو صورت دریا پر ہوئی تھی وہی صورت میدان جنگ میں

ہوتی۔ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا
مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ (سورۂ بقرہ پارہ ۲)

جب ان پر قتال فرض کیا گیا تو قلیل کے سوا سب
بھاگ گئے اور اللہ ان ظالمین کا جاننے والا ہے۔ اب
یہاں سے اندازہ لگائیے کہ یہی صورت حال یہاں ہے
مافعلوہ الا قلیلا منھم۔ ہمارے سنگین حکم کی تعمیل
بس تھوڑے لوگ کرتے ورنہ سب نافرمانی کرتے تو جنگ
اُحد اور حنین سے چلے جانے والے کتنے ہوں گے
اور ثابت قدم کتنے ہوں گے۔ اکثریت چلے جانے والوں
کی ہو تو ان سب کو سزا میں تلوار کے گھاٹ اتار دینا جب
کہ کفار کی پیہم یورش رہے کیا یہ قرین مصلحت ہوتا؟ اور کیا
یہ اکثریت بغیر جنگ و قتال کے قتل ہو جاتی۔ عفو و درگزر
سے کام لیا گیا تاکہ جن کے دلوں میں کچھ بھی صلاحیت ہے
وہ ہوش مند ہو کر فیضان نبیؐ سے اثر لے کر صحیح مومن ہو
جائیں ورنہ کم از کم ان کی آئندہ نسلوں سے جو مومن پیدا ہونے

والے ہیں ان کے ساتھ ان کا خاتمہ تو نہ کیا جائے۔

ہماری پیش کردہ ایک آیت یہ بھی تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ
يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ
اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ
خٰلِدُوْنَ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا
اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا
مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (المائدہ رکوع ۱۱)

"اے نبیؐ! تم ان میں سے کثیر لوگوں کو دیکھتے ہو کہ وہ
کافروں سے محبت رکھتے ہیں جو عمل وہ اپنے نفسوں کے
لیے کر رہے ہیں برا ہے، خدا ان سے ناراض ہوا اور وہ
لوگ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے اگر یہ لوگ اللہ اور نبیؐ پر
ایمان رکھتے ہوتے اور قرآن کو مانتے ہوتے تو کفار کو
دوست نہ بناتے لیکن ان میں زیادہ لوگ فاسق ہیں۔
مخاطب محترم ہماری پیش کردہ آیت مذکورہ پر فرماتے
ہیں۔" اس آیت میں ان سخط اللہ علیہم کہ اللہ نے

ان پر غضب فرمایا کا مصداق صحابہ کو ٹھہرایا گیا ہے حالانکہ آیاتِ مجیدہ کے ابتدائی الفاظ تریٰ کثیراً منھم میں ھُم کی ضمیر کا مرجع اس سے قبل آیت ۷۸/۵ میں سامنے موجود ہے بنی اسرائیل لُعن الذین کفروا ان تعصب - ہم نے پہلے ہی لکھا تھا کہ اس عنوان کو ذرا مغلوب الغضب ہو کر شروع کیا ہے۔"

مخاطب عزیز ہم نے تو نہ اس آیت میں صحابہ کا نام لیا نہ کسی دوسری آیت ِ مذمت میں ہم تو صرف یہ دکھا رہے ہیں کہ عہدِ نبیؐ کے کچھ نام نہاد مسلمان اس طرز کے تھے کہ یہودیوں سے یارانہ جوڑتے تھے صحابہ تو ہر کس و ناکس کو بنانے والے آپ ہی ہیں - اب رہا آپ کا یہ فرمانا کہ یہ آیت بنی اسرائیل یعنی یہودیوں کے بارہ میں ہے - اگر آپ کو آیت کے سباق و سباق سے یہ خیال پیدا ہوا تو میں اس شبہ کو اس طرح زائل کیے دیتا ہوں کہ ایک بچہ بھی آسانی سے سمجھ سکے - اس میں کوئی شک نہیں کہ اس آیت سے پہلے اور بعد میں یہودیوں کا ذکر

ہے لیکن درمیان میں ان یہودیوں سے دوستانہ رکھنے والے مدعیانِ اسلام کا ذکر ہے - اس آیت سے پہلے فرمایا گیا ہے لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل لعنت کی گئی ہے ان پر جو بنی اسرائیل میں سے کافر ہوئے - اس جملۂ آیت میں الذین کفروا کہا ہے یہودیوں کو - اب آیت زیرِ بحث میں فرمایا جاتا ہے تریٰ کثیراً منھم یتولون الذین کفروا - اے رسولؐ تم ان میں سے بہت لوگوں کو دیکھتے ہو کہ وہ دوست بناتے ہیں ان کو جو کافر ہیں جس طرح پہلی آیت میں الذین کفروا ہیں یہودی - اسی طرح الذین کفروا یہاں ہیں یہودی - ان یہودیوں سے محبت اور دوستی کرنے والے کوئی دوسرے لوگ ہی تو ہوئے جن کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ الذین کفروا یعنی یہودیوں سے دوستی کرتے تھے اگر اللہ اور رسولؐ اور قرآن پر ایمان رکھتے ہوتے تو یہودیوں کو کبھی اپنا دوست نہ بناتے - اس سے واضح ہو رہا ہے کہ یہودیوں سے محبت اور دوستی رکھنے والے ایسے مدعی تھے کہ ہم اللہ، رسول اور قرآن پر ایمان

رکھتے ہیں حالانکہ اگر ان کا اللہ، رسولؐ اور قرآن پر ایمان ہوتا تو یہ یہودیوں
سے دوستانہ نہ رکھتے۔ آیت مذکورہ کے بارہ میں یہ فیصلہ کر دینا
کہ صرف یہودیوں کا ذکر ہے اسکو کوئی عقلمند نہیں مان سکتا کیونکہ یہ آیت تقابلہ
کے دو گروہ پیش کر رہی ہے ایک گروہ تو وہ ہے جو محبت رکھتا ہے اور ایک گروہ
وہ ہے جس سے محبت رکھتا ہے تو اگر آپ کے نزدیک محبت
رکھنے والے یہودی ہیں تو جن کفار سے وہ محبت رکھتے ہیں
وہ کوئی اور ہوئے۔ اور اگر محبت کیے جانے والے کفار
یہودی ہیں تو ان یہودیوں سے محبت رکھنے والے
کوئی اور ہوئے۔ ہر صورت میں آپ کو یہودیوں کے
علاوہ کوئی دوسرا گروہ ضرور ماننا پڑے گا۔ وہ دوسرا گروہ
اگر ہمارے نبیؐ کی نبوت سے کھلم کھلا انکار کرتا ہے
اور کھل کر منکر قرآن ہے تو آیت کا یہ لفظ بے کار ہوا
کہ یہ لوگ اللہ، نبیؐ اور قرآن پر اگر ایمان رکھتے تو کفار
کو دوست نہ بناتے۔ ان کے ایمان باللہ، ایمان بالنبیؐ
اور ایمان بالقرآن کی نفی تو اسی وجہ سے کی گئی کہ وہ بجائے

خود ایمان کے دعوے دار تھے۔ قرآن مجید نے بار بار
بعض مسلمانوں کی شکایت کی ہے کہ یہ لوگ مسلمان ہونے
پر بھی یہود و نصاریٰ سے محبت رکھتے ہیں چنانچہ سورۂ مائدہ
میں فرمایا جاتا ہے۔ یا ایہا الذین امنوا لا تتخذوا
الیہود والنصاریٰ اولیاء بعضہم اولیاء بعض
ومن یتولہم منکم فانہ منہم ان اللہ لا
یہدی القوم الظالمین فتری الذین فی
قلوبہم مرض یسارعون فیہم یقولون نخشیٰ
ان تصیبنا دائرۃ ط یہود و نصاریٰ آپس میں تو
ایک دوسرے کے دوست ہیں ہی مگر اے
وہ کہ جو ایمان لائے تم ان کو دوست نہ بناؤ۔ اور جو بھی
تم میں سے ان کو دوست بنائے گا تو وہ بھی ان ہی میں سے
ہے۔ اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔ اے رسولؐ تم دیکھتے
ہو کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ ان یہود و نصاریٰ سے
گھل مل جاتے ہیں اور ان سے دوستی کرنے میں جلدی

کرتے ہیں۔ اور (اسکی وجہ) بتلاتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں (کہ اگر محض مسلمانوں کے طرفدار ہیں تو ہم چکر میں نہ آجائیں) آیت صاف بتا رہی ہے کہ بعض مسلمان یہود و نصاریٰ سے اس لیے دوستی رکھتے تھے کہ اگر مسلمان مغلوب ہو جائیں تو یہود و نصاریٰ سے ہماری دوستی ہمارے لیے مفید ہوگی چنانچہ قرآن شریف مترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب کے حاشیہ پر موضح القرآن شاہ عبدالقادر صاحب کی یہ عبارت موجود ہے "یعنی منافق کافروں سے دوستی لگاتے جانتے ہیں کہ ہم پہ گردش نہ آجائے یعنی مسلمان مغلوب ہو جائیں ان کی دوستی ہمارے کام آئے" موضح القرآن شاہ عبدالقادر

اب تو پورے طور پر ثابت ہو گیا کہ بعض مسلمان یہود و نصاریٰ سے ساز باز کیے ہوئے تھے۔ ہماری پیش کردہ آیاتِ مذمت کو ناظرین ہمارے کتابچہ "صحابیت کا قرآنی تصور" میں ملاحظہ فرمائیں۔

آخر میں ہم پھر ایک بار اس جملہ کو دہراتے ہیں کہ عہد

مقدس نبوی میں منافقین کا زبردست ہجوم تھا اور آیاتِ قرآنیہ کے اشاروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مومنین مخلصین سے یہ گروہ عدداً بہت زیادہ تھا۔ اکثریت منافقین کی تھی۔ اس گروہ کثیر سے عفو و درگزر اور اعراض کا جا بجا الٰہی حکم تھا جسکی بنا پر نہ ان سے کوئی انتقام لیا گیا نہ ان کو کوئی قرار واقعی سزا دی گئی نہ ان کا کوئی قتلِ عام ہوا یہ لوگ اپنی جگہ باقی رہے۔ تا اینکہ حضور کی وفات ہو گئی ہمارے مخاطبِ محترم کا یہ ارشاد کہ وقتِ وفاتِ نبی کوئی منافق موجود نہ تھا۔ یہ بالکل بے بنیاد اختراع ہے۔ چنانچہ آیہ قرآنی یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ۔ الخ "اے ایمان والو جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا" الخ اس آیت کے تحت میں شاہ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں "جب حضرت کی وفات پر عرب دین سے پھرے تو حضرت صدیق نے یمن سے مسلمان بلا کے ان سے جہاد کر دیا کہ تمام عرب پھر مسلمان ہو گئے" (موضح

القرآن شاہ عبد القادر) اب فرمایئے کہ اگر وفات نبیؐ کے
وقت کوئی بھی منافق باقی نہ تھا اور سب سچے مومن ہو گئے
تھے تو وفات نبیؐ پر یہی سچے مومن کیا پھر مرتد ہو گئے
تھے کہ جن سے مقابلہ کے لیے مدینہ، مکہ، طائف وغیرہ کے
مسلمان بھی نہ رہے تھے کہ حضرت صدیق کو یمن سے
مسلمان بلوانا پڑے اور ان سے جہاد کروایا کہ تمام عرب
پھر مسلمان ہوئے۔ یہ لوگ پھر مسلمان بھی ہوئے تو جہاد
کے زور سے ہوئے۔ جو لوگ جہاد کے زور سے مسلمان ہوں
خواہ وہ نبیؐ کا زمانہ ہو یا زمانۂ مابعد ہو وہ کس نوعیت کے
مسلمان ہوں گے اسکو ہر صاحب عقل اچھی طرح
سمجھ سکتا ہے۔ جو دین تلوار کے ڈر سے اختیار کیا جائے
گا اس کی بنیاد نہ خوفِ خدا پر ہوگی نہ حصولِ رضا خدا
پر۔ اس طرح کا دین محض دنیا کے لیے ہوگا۔ آخرت کے
لیے نہیں۔ ہمارا ارادہ نہیں ہے کہ ہم آئندہ اس بحث کو
جاری رکھ کر تضیع اوقات کریں ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ

ہمارے مخاطب محترم کی طرف سے جواب تو کسی ایک
چیز کا بھی نہیں ہوتا مگر باتیں اتنی لمبی چوڑی کہ بلبل ہزار داستان
کا بھی ان کے سامنے نام ہی نام ہے۔

مکرر گزارش ہے کہ یہ بات اظہر من الشمس ہو چکی ہے
کہ قرآن کریم نے کسی ایک جگہ بھی کسی ایک نبیؐ کے بھی
مددگار یا مددگاروں کو صاحب نبیؐ یا اصحاب نبی نہیں فرمایا
یہ لفظ قرآنِ مجید میں صرف دو جگہ ہے اور ہر جگہ ساتھ والے،
ساتھ والوں کے معنی میں آیا ہے۔ جناب موسیٰ علیہ السلام
کے ساتھ والوں کے عقائد و رجحانات سب بیان کیے
گئے تاکہ یہ پورے طور پر ثابت اور واضح ہو جائے
کہ لفظ اصحاب، اصحابِ موسیٰؑ میں کسی مدح و ثنا کے
لیے نہیں ہے۔ ہمارے مخاطب چونکہ تاریخ و حدیث
کے سلسلہ ذخیرہ کے بھی منکر ہیں اس لیے ہم نے بھی اپنی
تمام تر استدلالی بحث کا دار و مدار قرآن کریم ہی کو قرار دیا
ہے لیکن ممکن ہے کہ بعض ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ

لفظِ اصحاب احادیث میں تو موجود ہے۔ اگر ہمارے
مخاطب انکارِ حدیث کی وجہ سے کچھ نہیں بول سکتے، تو
دوسرے مسلمان تو منکرِ حدیث نہیں ہیں۔ یہ لفظ جب
غیر قرآنی تھا تو احادیث میں کیسے آیا؟ اور آیا تو اس کو
غیر قرآنی کیسے مانیں۔ میں عرض کروں گا کہ آنحضورؐ کا خود
یہ ارشاد ہے کہ میری حدیث کو قرآن پر پیش کرو۔ مطابقت
کرے تو وہ قول میرا قول ہے۔ مخالف ہو تو وہ کوئی چیز نہیں
یہ نہیں فرمایا کہ قرآن کو حدیث پر پیش کرو اور اس طرح
سے طے کرو کہ وہ قرآن ہے کہ نہیں۔ لہٰذا حدیث کا
فیصلہ قرآن سے ہوگا۔ قرآن ہے یا نہیں؛ اس کا فیصلہ
حدیث سے نہیں۔ جب قرآن نے صاحب نبیؐ یا
اصحاب نبیؐ کا کسی کو لقب نہیں دیا تو نبیؐ ہر جگہ تابع
اندازِ قدرت ہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ جو لقب اس عہد
کے مسلمانوں کو قرآنِ کریم نے دیئے تھے مسلمین، مومنین
السابقون، الاولون، المہاجرون، الانصار، اہل البیت

اجمعین، ان القاب قرآنی کو چھوڑ کر نبی کریمؐ غیر قرآنی کوئی
لقب دے دیتے۔ لفظ اصحاب والی احادیث میں کچھ احادیث
تو وہ ہیں جن کے ضعیف اور موضوع ہونے پر مستقل بحث
ہوتی رہی ہے۔ جیسے کہ ایک فاضل رحمۃ اللہ علیہ نے نشاندہی
کی ہے اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم
"میرے اصحاب ستاروں کے مثل ہیں۔ تم نے ان میں سے
جس کی بھی اقتدار کی تو تم نے ہدایت پالی۔" یہ تم کون ہیں؟
نبیؐ کے سامنے غیر صحابہ تو کوئی بھی نہیں جن سے نبیؐ اپنے
صحابہ کی اقتدا، کے لیے فرمائش کریں۔ یہ تم جن سے کہا
گیا کون ہیں؟ صحابہ صحابہ یعنی تم اقتدار کرو، کس کی؟
صحابہ کی! تو صحابہ ہی ہوئے مقتدی اور صحابہ ہی ہوئے
مقتدار۔ اگر یہی ہوتا کہ ہر ایک صحابی اقتدار کرے جماعت
صحابہ کی تو بھی کوئی تُک تھا مگر صحابی، اقتدار کرے کسی
ایک صحابی کی تو وہ ایک صحابی تو یہ خود ہی ہے یا اگر
یہ ہوتا کہ میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں جس نے

ان کی اقتدا کی ہدایت پائی - تو یہ جملہ آنے والوں سے
متعلق ہوکر معناً صحیح ہوجاتا مگر جملہ یہ نہیں ہے -
بہرحال یہ ضروری ہے کہ جن لوگوں کو پیروی کرنے کا
حکم دیا جائے وہ اور ہوں اور جن کی پیروی کا حکم دیا جائے
وہ اور ہوں - یہاں ان کو ہی پیروی کرنے کا حکم دیا جارہا
ہے اور ان کی ہی پیروی کا حکم دیا جارہا ہے ظاہر ہے
کہ ارشادِ نبیؐ میں یہ سقم جو قابلِ عمل ہی نہیں ہے ہرگز نہیں ہو
سکتا - نبیؐ کا حکم انتہائی حکیمانہ ہوتا ہے - جیسے کہ آپ نے
فرمایا - انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی
"میں تم میں جو دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں کتابِ خدا کو
اپنی عترت کو، تم میں" یہ خطاب صحابہ سے ہے - قرآن و
عترت سے نہیں ہے - ما ان تمسکتم بہما لن تضلوا
بعدی - جب تک تم یعنی صحابہ اور ان کے بعد آنیوالے
ان دونوں سے وابستہ رہو گے کبھی گمراہ نہ ہوگے - جو بات کہی
گئی ہے وہ کہی گئی ہے قرآن اور اہلبیتؑ کے بارہ میں اور کہی

گئی ہے ان سے جو قرآن اور اہلبیت کے علاوہ ہیں اور
ہوں گے لیکن جملۂ سابقہ یعنی تم نے میرے اصحاب میں سے
جس کی پیروی کی تو تم نے ہدایت پالی یہاں ہر ایک اپنا ہی
مقتدی اور اپنا ہی مقتدا ہے - یہ تضاد قولِ رسولؐ میں نہیں ہو
سکتا - غرضیکہ اصحاب والی احادیث ان میں بعض کی موضوعیت
زیر بحث ہے اور بعض کے متعلق یہ ہے کہ چونکہ تدوینِ حدیث سے
پہلے لفظ صحابہ زبان زدِ خاص و عام ہو چکا تھا، ذہنوں میں زبانوں پہ
یہ لفظ جم گیا تھا اسلئے راوی نے یہ لفظ روایت باللفظ کی حیثیت کی بجائے
روایت بالمعنی کے انداز پر بیان کر دیا اور یہ انداز واقعات کے بیان کرنے
میں آج بھی عام ہے مثلاً نبیؐ سے ہم کسی کا مکالمہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ
اُسنے کہا کہ اے نبیؐ خدا بجائے اس نے اپنی جگہ اے رسولِ خدا ہی کہا ہو یا کہ
ہی کسی انداز میں خطاب کیا ہو واقعہ اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن راوی کی روایت
کا یہ پہلو کہ اُسنے صرف اسی لفظ سے خطاب کیا تھا جو روایت میں ہے
یقینی نہیں ہے کیونکہ روایت کے ایسے پہلو روایت بالمعنی کے انداز سے
بھی ہوتے ہیں لہذا لفظ اصحاب والی احادیث میں یہ امر بعید نہیں ہے کہ

آنحضورؐ نے اپنے عہد کے مسلمانوں کے ذکر میں استعمال فرمایا ہو نقطۂ قرآنی مگر
نقل قولِ نبیؐ کے وقت راوی نے اس لفظ کا مفہوم لیکر اس لفظ (اصحاب) سے
تعبیر کیا ہو جو کثیر الاستعمال اور مشہور تھا۔ محدثین نے یہ طے کیا ہے کہ روایت
حدیث کے بعض پہلو روایت باللفظ کی بجائے روایت بالمعنیٰ کی حیثیت میں بھی
ہیں۔ بہرحال ہم نے فاضل مخاطب کے لیے اس معاملہ کو ایسی جامعیت سے تحریر کر دیا ہے
کہ جو کچھ وہ کہہ چکے ہیں اسکی تردید بھی بحد کافی ہوگئی اور جو کچھ آئندہ کہیں گے اسکا جواب بھی ہمارے
بیان کے کسی جزء میں ملتا رہیگا بشرطیکہ وہ بالکل بے تعلق اور بے جوڑ باتیں نہ شروع کردیں

سید محمد جعفر